اکتوبر ۸۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

قومی سیاست کی تاریخ کے تناظر میں

مذہبی و سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی خدمت میں

چند مخلصانہ مشورے ـــــ ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

نام بھی اچھّا ۔ کام بھی اچھّا
صُوفی سوپ ہے سب سے اچھّا

صُوفی سوپ

اُجلی اور کم خرچ دُھلائی کے لیے بہترین صابن

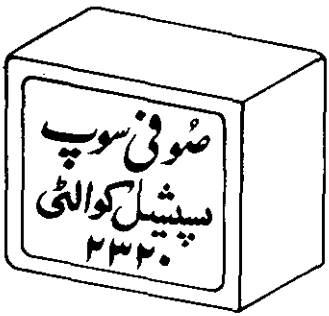

صُوفی سوپ اینڈ کیمیکل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
تار: صُوفی سوپ ٹیلکس:
۳۹۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور۔ ٹیلی فون نمبر: ۲۲۵۴۴۷ - ۵۴۵۲۳

ماہ اکتوبر میں ایمان کی بہار

اِن شاءَ اللہُ العزیز
کوئٹہ شہر میں امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

۱۰ اور ۱۱ اکتوبر ۸۸ء بروز سوموار اور منگل

گورنمنٹ سائنس کالج آڈیٹوریم جناح روڈ میں
دونوں دن بعد نماز مغرب

حقیقتِ ایمان

کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے، عنوانات پشت پر ملاحظہ فرمائیں

اُخروی فوز و فلاح کی شرطِ لازم

اور اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کی نظریاتی اساس کے
فہم و شعور کے لیے ـــــــ اس موقع کو غنیمت سمجھیں!

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"

عنوانات

سوموار ۱۰ر اکتوبر ۸۸ء

★ ایمان کے لفظی معنی ★ ایمان کا اصطلاحی مفہوم
★ ایمان کا موضوع ـــــ مابعد الطبعیاتی مسائل
★ ایمانیاتِ ثلٰثہ ـــ توحید، معاد، رسالت ـــ کا باہمی ربط
★ ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصّل
★ ایمانیات ثلٰثہ کی تقابلی اہمیّت
اور
★ ایمان کے دو درجے ـــــ قانونی ایمان اور حقیقی ایمان

منگل ۱۱ر اکتوبر ۸۸ء

❶ ایمانِ حقیقی یا یقینِ قلبی
کے داخلی اور خارجی ثمرات

★ داخلی ثمرات ـــــ ذہنی اطمینان اور قلبی امن وسکون
★ خارجی ثمرات ـــــ عملِ صالح اور جہاد فی سبیل اللہ

❷ ایمان کے اجزائے ترکیبی اور اس کے حصول کے ذرائع

★ نورِ فطرت اور نورِ وحی

★ ایمان ویقین کا اصل منبع وسرچشمہ ـــــ قرآنِ حکیم
★ ایمان کے اضافی ذرائع ـــــ تزکیۂ نفس اور صحبتِ صالح

اِنْ شَآءَ اللّٰہُ الْعَزِیْز

تنظیمِ اسلامی حلقۂ وسطی پنجاب کا

سہ روزہ علاقائی اجتماع

۱۹، تا ۲۱، اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز بدھ تا جمعہ

بمقام: دارالبلوچاں، عقب پرانی جیل

گجرات

منعقد ہوگا، جس کے دوران دوسرے تنظیمی اور تربیتی پروگرام کے علاوہ

۱۹، اور ۲۰، اکتوبر کو بعد نمازِ عشاء

امیر تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

جلسۂ عام سے خطاب فرمائیں گے۔

بیرونِ حلقہ سے تشریف لانے والے حضرات ۱۹، اکتوبر کو صبح دس بجے تک

دفتر تنظیمِ اسلامی، دارالبلوچاں، عقب پرانی جیل پہنچ جائیں

المعلن: شمس الحق اعوان، امیر تنظیمِ اسلامی گجرات، و ناظم اجتماع

الحمد للہ کہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ذیلی تنظیم

انجمن خدام القرآن سندھ کراچی

کو ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی درخشاں اسکیم میں

مسجد کی تعمیر کے لئے ایک پلاٹ حاصل ہو گیا ہے

جس پر **جامع القرآن** کی تعمیر

کا آغاز انشاء اللہ العزیز بہت جلد ہو جائے گا!

اور ماہ ربیع الاوّل کی مناسبت سے اسی پلاٹ پر

جمعرات اکتوبر ۸۸ء کو بعد نماز مغرب

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر موسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور — و امیر تنظیم اسلامی پاکستان

"سیرتِ نبویؐ کا انقلابی پہلو"

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!"

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔ القرآن

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۷

شمارہ ۱

صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

اکتوبر ۱۹۸۸ء

فی شمارہ ۵/-

سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ - امریکی ڈالر

یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ - امریکی ڈالر

شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ - امریکی ڈالر

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴

سب آفس: ۱۱ - داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

(نوٹ) خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

مشمولات

عرضِ احوال ——— ۳

اقتدار احمد

تذکرہ وتبصرہ ——— ۹

قومی سیاست کی تاریخ کے تناظر میں مذہبی و سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی خدمت میں چند گزارشات اور مشورے

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطابِ جمعہ

طلبہ کے مسائل اور ان کا حل ——— ۳۹

ڈاکٹر اسرار احمد

پاکستان کی موجودہ صورتِ حال میں اسلامی انقلاب کی ضرورت ——— ۵۷

ایک ہمہ پہلو جائزہ

نعیم اختر عدنان

آخرت پر ایمان (دوسری قسط) ——— ۷۳

محمد غوری صدیقی

طلبائے تنظیم اسلامی کا پہلا آل پاکستان کنونشن ——— ۷۹

مرتب: چوہدری غلام محمد

چند یادیں، چند باتیں ——— ۸۵

مولانا عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

رفتارِ کار ——— ۹۱

امیر تنظیم اسلامی کا دورۂ وہاڑی و بہاولپور

مرتبین: محمد سعید بھٹہ / منظور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

گذشتہ ماہ دو خطبات جمعہ میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی پاکستان نے ملک کی اکتالیس سالہ سیاسی تاریخ کا ایک جائزہ پیش کیا اور اس کے پس منظر کے ساتھ ساتھ آئندہ عام انتخابات کے تناظر میں قومی سیاسی جماعتوں اور مذہبی و دینی گروہوں کو نام لے لے کر کچھ مشورے بھی دیئے۔ یہ سب باتیں تقریباً پوری کی پوری "میثاق" کی اس اشاعت میں شامل ہیں۔ عین ممکن ہے کہ قارئین کے ذہن میں بھی ان کے مطالعہ کے بعد یہ خیال پیدا ہو لیکن بعض احباب نے ان خطبات کو سن کر یا اخبارات میں 'ان کی ادھوری رپورٹ پڑھ کر ہی اس ردعمل کا اظہار کیا کہ امیر تنظیم کو اپنی بات ماضی کے حوالے سے کہہ کر ختم کر دینی چاہئے تھی' مختلف جماعتوں اور گروہوں کو براہ راست مخاطب کرنا غیر ضروری تھا' جن سے یہ توقع تو عبث ہے کہ یہ باتیں انہوں نے گوش حقیقت نیوش سے سنی ہوں البتہ انہیں اپنے معاملات میں مداخلت قرار دے کر ایک طرح کی تلخی ضرور محسوس کی ہو گی۔ "عرض احوال" میں ہم اسی خیال پر گفتگو کریں گے۔ ہم جو کچھ کہنا چاہ رہے ہیں اس کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی انداز میں ان خطبات میں بھی یقیناً موجود ہے لیکن تمہید کے طور پر انہیں الگ سے بیان کر دینا بھی مفید ہو گا۔

اس معاملے کے چند پہلو تو ایسے ہیں جن کا ذکر ہی کافی ہے' کسی لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں البتہ کچھ دیگر گوشوں پر نسبتاً زیادہ تفصیل سے بات کرنی ہو گی۔ اول الذکر پہلو کے عنوانات یہ ہیں کہ.....

۱..... ڈاکٹر صاحب موصوف اور تنظیم اسلامی سے منسلک افراد مروجہ انتخابی سیاست سے تو کامل اجتناب برتتے ہیں لیکن سیاست بذات خود ان کے لئے شجر ممنوعہ نہیں۔ انقلابی سیاست تو وہ کر ہی رہے ہیں' مروجہ سیاست کے اتار چڑھاؤ اور ملکی حالات سے باخبر رہنا اور حسب ضرورت لوگوں کو ان کے نتائج و عواقب سے آگاہ رکھنا بلکہ خبردار کرتے رہنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

۲..... مروجہ ملکی سیاست پر صرف وہ لوگ ہی اثر انداز نہیں ہوتے جو لنگر لنگوٹے کس کر اکھاڑے میں اترے ہوئے ہوں۔ ملک و قوم کے بظاہر غیر متعلق لیکن سوچنے سمجھنے والے

خیر خواہ بھی اپنے بروقت مشوروں کے ذریعے ان معاملات میں ایک تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مثبت انداز میں کہا جائے تو باشعور اور قلم پر قدرت رکھنے والے صحافیوں کے کام کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو بلا واسطہ حصہ لئے بغیر بھرپور سیاست کرتے ہیں اور منفی اسلوب میں بات سمجھانی ہو تو ہم قارئین کو یاد دلاتے ہیں کہ امریکی سیاست پر ایک خورد بینی اقلیت پس منظر میں رہ کر بھی محض اس بنا پر تسلط جمائے ہوئے ہے کہ ذرائع ابلاغ پر اس کا قبضہ ہے۔ مٹھی بھر یہودی بلکہ صیہونی اس سپر پاور کی داخلی و خارجی حکمت عملی پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہیں۔

۳..... "الدین النصیحة" کی جو تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اس کے مطابق ملک کی کوئی جماعت بلکہ عامۃ المسلمین میں سے بھی کوئی فرد اس دائرے سے باہر نہیں رہ جاتا جو نصح و خیر خواہی کی لکیر نے معاشرے کے گرد اگرد کھینچ دیا ہے۔

۴..... ہر موقع محض اصولی باتیں کہہ کر بس کر دینے کا نہیں ہوتا۔ اشاروں کنایوں میں بات کی جائے تو ہر شخص کسی دوسرے کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے اور قائل کا مقصد ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں اس امر کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ لوگوں کو فرداً فرداً متوجہ کر کے مشورے اور نصیحت کا حق ادا کیا جائے۔ ہاں اس کی نوبت آ جائے تو ہمدردی، دلسوزی اور دانائی کے عناصر خطاب میں ضرور شامل ہونے چاہئیں اور ظاہر ہے کہ ان لوازم کا مکلف ہر کہنے والا اس صلاحیت کی حد تک ہی ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائی ہو۔

۵..... ایسے مواقع پر جب بات کو صاف صاف کہنا قوم اور معاشرے کے حق میں سود مند ہو، گول مول باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن میں سے کچھ کو اپنے موقف کے صحت و صواب پر اعتماد نہیں ہوتا، کچھ مصلحت کا مونہہ دیکھتے رہتے ہیں اور کچھ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ بعد میں اپنی بقراطیت کا لوہا منوائیں گے کہ دیکھا ہم نے تو اشارہ کر دیا تھا، تم ہی ایسے کودن تھے جو سمجھ نہ پائے۔

ان اشارات کے بعد جن عوامل پر ہم قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے قارئین کو دعوت فکر دیں گے، وہ درج ذیل ہیں۔

۱..... ہمارے ملک میں بحران کی کیفیت اور حالات کی نزاکت یوں تو ضرب المثل بن چکی ہے، کوئی دن نہیں گیا جب یہ الفاظ تکیہ کلام کے طور پر استعمال نہ ہوئے ہوں لیکن آج کل حالات ہمیں جس موڑ پر لے آئے ہیں وہ واقعی بالکل نیا ہے۔ ہمارے دائیں بائیں، آگے پیچھے صورت حال اس سے پہلے کبھی یوں بے وقت مخدوش نہیں ہوئی تھی۔ دنیا کی دونوں

سپر طاقتوں کی یکساں توجہ کے مرکز ہم اس طرح کبھی نہ بنے تھے۔ مارشل لاء کی ایسی طوالت ماضی میں یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ملک کی سیاسی قوتیں اس انداز میں کبھی شل نہ ہوئیں۔ ملک کے باشندوں میں علاقائی اور لسانی بنیادوں پر اس قدر واضح اور موثر تقسیم پہلی بار دیکھنے میں آئی ہے۔ ایک ہی شہر اور محلے کے باسی کلمہ گو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے جان و مال اور عزت و آبرو پر درندوں کی طرح حملے اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے۔ شعائر دینی اور حدود اللہ پامال تو پہلے بھی تھیں لیکن ان کا مشلہ یوں کب ہوا۔ شریعت پر دو فرقوں کے درمیان اختلاف اور الحاد و اباحیت زدہ طبقے کی طرف سے اس کا استہزا ہوتا آیا ہے لیکن خود اہل سنت کے مابین اس کی تعبیر اور نفاذ پر مرنے مارنے کے لئے یہ صف آرائی تو کبھی نہ ہوئی تھی جو شامت اعمال نے ماضی قریب میں ہمیں دکھائی۔ غرض آج ہم بحران اور حالات کی نزاکت کی جس کیفیت سے دوچار ہیں وہ روایتی نہیں' بہت ہی منفرد اور معکوس معنی میں بڑی ہی مثالی ہے۔ یہ وقت اشاروں کنایوں میں بات کرنے کا نہیں' کھل کر کہنے کا ہے کہ ہنوز ظ

غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

۲..... سانحہ اوجڑی کیمپ کے بعد سے اور بالخصوص (۲۹ر مئی) کی تاریخ سے پاکستان پے در پے ایسے واقعات سے دوچار ہے جس نے صورت حال میں بہت بڑی بڑی اور بنیادی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ وہ کچھ وقوع پذیر ہو گیا جو کسی کے سان گمان میں نہ تھا۔ سب نے دیکھا کہ ملک کی سیاسی سٹیج پر جو ڈرامہ سٹیج کیا جا رہا تھا' اس کا منظر ہی نہیں بدلا کہانی بھی بدل گئی' ماحول مختلف ہو گیا اور کرداروں کو نئے رول لینے پڑے۔ سیاسی مفاہمتوں اور مخاصمتوں کی بساط بعض صورتوں میں تو بالکل ہی الٹ کر رہ گئی۔ ہماری گذشتہ اکتالیس سالہ تاریخ میں ایسا موقع پہلے کبھی نہ آیا تھا کہ سیاست اور اہل سیاست یوں ٹھٹھک کر رہ گئے ہوں اور حالات و واقعات کے تیزی سے گردش کرتے پہیے نے انہیں مجبور کر دیا ہو کہ اس کے تھم جانے کا انتظار کریں۔ انتظار کے اس وقفے میں غور و فکر کی مہلت میسر آئی ہے جس سے فائدہ اٹھانا تبھی ممکن ہے جب ماضی کے تجربات کا تجزیہ کر کے آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد خود تو اس چکر میں پڑے ہی نہ تھے' ان کو اپنی سوچ کا زاویہ بدلنے کی ضرورت نہیں لیکن ملک کی سیاست پر موثر کردار ادا کر سکنے والے لوگوں کو توجہ دلانا ان کا فرض تھا اور ہے کہ اب اپنی حکمت عملی بدل ہی رہے ہو تو یوں بدلو کہ پچھلی کوتاہیوں کا ازالہ ہو جائے۔ خدا لگتی کہئے کہ کیا ہم سب لوگ ان دنوں نجی محفلوں میں اس انداز کی گفتگو

نہیں کرتے رہے کہ فلاں جماعت کو یہ کرنا چاہئے 'فلاں کو وہ کرنا چاہئے 'فلاں فلاں کو ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا چاہئے 'فلاں فلاں کو مل کر کام کرنا چاہئے ورنہ فلاں کا داؤ چل جائے گا 'فلاں کا جادو سر چڑھ کر بولے گا..... وغیرہ۔ تو اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں یہ باتیں سوچنا اور کہنا زیب دیتا ہے تو امیر تنظیم انہی کو اس سطح سے بیان کیوں نہ کریں جو ان کے لئے موزوں ہے۔ اس فورم کو استعمال کرنے میں جھجک کیوں محسوس کریں جو انہیں میسر ہے۔

۳..... تنظیم اسلامی کی انقلابی سیاست اگرچہ ابھی ابتدائی مرحلوں میں ہے لیکن ہم اس بات پر حق الیقین رکھتے ہیں کہ یہاں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا قیام انقلابی عمل سے ہی ہو گا اور یہ کہ پاکستان کی واحد وجہ جواز اور اس کے استحکام کا راز حقیقی اسلام کے واقعی نفاذ میں ہی مضمر ہے جس کے لئے ہم بساط بھر کوشاں بھی ہیں۔ تاہم ملک کو چالیس سالوں پر محیط سیاسی بدعملی نے افراتفری اور انتشار و خلفشار کی جس شدت میں مبتلا کر دیا اور اس کے وجود تک کو جس خطرے سے دوچار کر دیا ہے اسمیں کمی لانے کے لئے ایک فوری تدبیر کے طور پر یہاں جمہوریت کی عمل داری اور سیاسی عمل کی روانی سب سے زیادہ مطلوب حیلہ ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے 'نئے عام انتخابات سر پر ہیں جن کے بارے میں توقع ہوئی ہے اور مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ آزادانہ 'منصفانہ اور پوری طرح سیاسی (یعنی جماعتی) ہوں۔ بدقسمتی سے اس باب میں قوم کے تجربات بہت تلخ ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک دو ہی عام انتخابات ہوئے ہیں۔ ایک ۱۹۷۰ء میں جن کے بارے میں عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ آزادانہ اور خالص سیاسی تھے اور دوسرا ۱۹۷۷ء میں جو بھرپور انداز میں سیاسی تو تھے 'آزادانہ و منصفانہ نہیں۔ پہلے کے نتیجے میں ملک دولخت ہوا اور مسلمانوں کو بدترین شکست کی شکل میں تاریخی ذلت و رسوائی کا مونہہ دیکھنا پڑا تو دوسرے نے ملک کے طویل ترین مارشل لاء کو جنم دیا۔ گویا ملک گیر پیمانے پر عام انتخابات ہمیں راس تو کبھی نہ آئے لیکن ان کے بغیر اب چارہ بھی کوئی نہیں رہ گیا۔ ہم تاریخ کے جبر کا شکار ہیں یا ستم ظریفی کے 'بہرصورت اس مرحلے سے گذرنا تو ہو گا۔ ایسے نازک موقعے پر ہوائی باتیں کرنا اور آپ جناب کے تکلف میں پڑنا وہی لوگ گوارا کر سکتے ہیں جنہیں ملک و قوم سے محض مونہہ دیکھے کی محبت ہو 'حقیقی تعلق نہیں۔ کسی کے دل میں قوم کا واقعی درد ہو گا تو وہ لوگوں کی خوشی ناخوشی کی بھی پرواہ کئے بغیر اپنی بات بالکل متعین پیرائے میں کہنے پر مجبور ہو گا' صرف فارمولے دینے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ ایک ایک کا نام لے کر درخواست کرے گا' مشورے دے گا۔

۴..... پچھلے عام انتخابات کے مذکورہ مواقع پر ہمارے ان چوٹی کے صحافیوں اور سکہ بند دانشوروں نے جن کی "اسلام پسندی" مسلمہ تھی' اپنی "قلم کاری" اور چرب زبانی سے وہ سماں باندھا اور اسلام کے نام پر الیکشن کے میدان میں اترنے والی جماعتوں کو وہ سبز باغ دکھائے کہ انہیں "فتح مبین" سامنے پڑی نظر آنے لگی اور ان میں سے ہر ایک اس زعم کا شکار ہو گئی کہ بس اس بار تو پالا مار ہی لیا' اسلام آیا کہ آیا۔ اس تعلی میں ان کاغذی گھوڑے دوڑانے والوں اور جوش میں مونہہ سے جھاگ اڑانے والوں نے شاعرانہ گریز کا وہی انداز اختیار کیا تھا جو عام لوگ اب ہم سے بھی چاہتے ہیں کہ بات کہیں ضرور لیکن یہ پتہ نہ چلے کہ مخاطب کون ہے۔ لیکن کسے معلوم نہیں کہ ان دونوں مواقع پر اور خاص طور پر ۱۹۷۰ء میں سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ امیدوں پر پانی پھر گیا اور مرے پہ سو درے یوں کہ وہی اسلام پسند صحافی اور دانشور اپنی سابقہ تحریروں اور تقریروں کے روائتی ابہام کی آڑ میں اپنی ممدوح جماعتوں کا مذاق اڑانے پر اتر آئے اور حد درجہ ڈھٹائی کے ساتھ ان کی کوشش اور تدبیر میں کیڑے نکالتے پائے گئے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر اسرار احمد کا رویہ ریکارڈ پر ہے' سیاست و صحافت سے دور کا تعلق رکھے بغیر انہوں نے "میثاق" میں ملکی منظر و پس منظر کی وہ حقیقت پسندانہ نقشہ کشی کی اور مختلف جماعتوں' گروہوں اور شخصیات کو نام بنام وہ صاف صاف پیغام دیئے کہ اگر ان پر کان دھرا جاتا تو آج ہم ایک مختلف پاکستان میں زندگی گذار رہے ہوتے۔ آج سے اٹھارہ (۱۸) سال پہلے ان کی سیاسی بصیرت کا یہ عالم تھا تو اتنا زمانہ گزرنے پر جس میں ایک بچہ بھی سن بلوغ کو پہنچ جاتا ہے اور تاریخ و سیاست کے اتنے اتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظر میں جو وسعت پیدا ہو چکی ہوگی' اس کا اندازہ کیسے قائم کیا جائے۔ بایں ہمہ اگر وہ اس تاریخ ساز لمحے میں "ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم" پر عمل کریں اور اپنی سوچ کو عام کرتے ہوئے صاف صاف کہنے کی بجائے شرماشرمی سے کام لیں تو یہ بخل ہو گا' تھڑدلاپن ہو گا جس پر تاریخ انہیں معاف کرنے پر تیار نہ ہوگی۔

۵..... ہمارا ایک المیہ یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کی روح اور ایک مربوط اسلامی معاشرے کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے "غیر جانبداری" کا ایک خاص طرز عملی مستقلاً اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے دین کا مزاج تو یہ ہے کہ دو بھائیوں یا مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان تصادم پایا جائے تو دونوں جانب کے متعلقہ افراد بالخصوص اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والے اصحاب فہم و دانش بالعموم' معاملے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اختلاف کی نوعیت

کا تعین کریں۔ ان کے درمیان مصالحت و مفاہمت پیدا کرنے کی غرض سے پوری دلی آمادگی کے ساتھ بلکہ صورت حال میں خود کو کماحقہ 'مبتلا کر کے کوشاں ہوں اور اس کے بعد بھی اگر کوئی ایک فریق اپنے غلط موقف پر اڑا رہے تو اپنا وزن دوسرے فریق کے پلڑے میں ڈال کر زیادتی کرنے والی کی ٹھیک سے مزاج پرسی کریں۔ لیکن اب اس رویئے کو دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کا نام دیا جانے لگا ہے۔ چہ خوب! یہ غیر جانبداری کا خول نہیں' منافقت ہے' دھوکے کی ٹٹی ہے۔ آج قومی منظر پر جو محاذ آرائی نظر آتی ہے اور کسی بھی طور ملک و قوم کی بھلائی میں نہیں' اس کی گرم بازاری میں مصلحت کا اسیر ہو جانا اور ایک فریق کا نام لیتے اس لئے ڈرنا کہ دوسرا فریق کیا کہے گا' ہمارے قومی کردار کی اسی کمزوری کی علامت ہے۔

آخری بات ان خطبات میں ڈاکٹر اسرار احمد نے خود ہی ہم سے بہتر پیرائے میں کہہ دی ہے۔ جن لوگوں سے انہیں کوئی توقع تھی یا کسی درجے میں اب بھی باقی ہے' ان سے شکایت میں تلخی کچھ زیادہ ہی آ گئی۔ سچی بات تو ویسے ہی کڑوی ہوتی ہے' اپنے پیاروں سے کہی جائے تو اس کی کڑواہٹ میں شدت در آتی ہے۔ لیکن ہم درد دل کہتے ہی رہیں گے ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

ملک و قوم کو درپیش اس مرحلے پر کوئی یہ چاہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد مونہہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھے رہیں تو یہ خام خیالی ہے۔ انہیں مروجہ سیاست سے لینا دینا تو کچھ ہے نہیں۔ محسوس یہ کرتے ہیں کہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس سے زبوں حالی کے ذمہ داروں کو خبردار بھی نہ کیا تو خدانخواستہ وہ خطہ ارضی ہی ہم سے نہ چھن جائے جس میں اللہ کی کبریائی کا خواب ہم دیکھتے ہیں' جس کے بارے میں یہ تمنا دلوں میں پال رہے ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا نکتہ آغاز بن جائے۔ ایسا نہ ہو کہ پھر کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ رہے ؎

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

★★★

برائے فوری توجہ
مورخہ دو اکتوبر ۱۹۸۸ء سے
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن
کے نئے ٹیلی فون نمبرز
پرانے نمبر
۸۵۲۶۱۱
۸۵۲۶۸۳
نئے نمبرز
۸۵۶۰۰۳
۸۵۶۰۰۴

قومی سیاست کی تاریخ کے تناظر میں
مذہبی و سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی خدمت میں
چند گزارشات اور مشورے

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطابِ جمعہ
(ترتیب وتسوید: حافظ خالد محمود خضر)

پاکستان کے موجودہ حالات میں جو پہلو تشویش ناک یا مایوس کن ہیں ان کے ضمن میں بارہا آپ حضرات کے سامنے تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ میں نے بارہا یہ بھی عرض کیا ہے کہ میں مزاج کے اعتبار سے غالباً قنوطیت پسند انسان ہوں اور حالات کے تاریک پہلو پر کچھ زیادہ نگاہ رکھنے کا عادی ہوں۔ اس کا فائدہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو مایوسی سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ بقول شاعر ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے!

اگر حالات کے بارے میں آپ کا مطالعہ اور تجزیہ امید بھرا نہیں بلکہ مایوس کن ہے تو جو بھی صورت حال سامنے آئے گی اس کو قبول کرنے کے لئے آپ پہلے ہی ذہناً تیار ہوں گے۔ لہٰذا میں ان موضوعات پر تفصیلاً گفتگو بھی کرتا رہا ہوں اور لکھتا بھی رہا ہوں میری کتاب "استحکام پاکستان" اور اس کے بعد "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" شائع ہو کر اب خاصی بڑی تعداد میں ہمارے معاشرے میں پھیل بھی چکی ہیں۔ میں نے پاکستانی معاشرے کے بارے میں اخلاقی زوال اور اخلاق کے بحران کا تذکرہ بھی بارہا کیا ہے۔ پھر یہ کہ نہ صرف جو اندرونی خلفشار ہے اس کا تذکرہ ہوتا رہا ہے بلکہ بیرونی خطرات جو ہمارے وجود تک کے لئے ایک زبردست خطرہ

ہیں ان سب کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ لہٰذا کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ جمعہ کی گفتگو کے حوالے سے چند نکات میں اس وقت کی صورت حال کا تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ امّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود..... امت مسلمہ کا مقصد وجود اور اس کا فرض منصبی بعثت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مقصد کی تکمیل ہے۔ قرآن حکیم میں اس امت کی غرض وغایت یہ بیان ہوئی:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط

"اے مسلمانو! ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت (ایک بہترین امت) بنایا ہی اس لئے ہے تاکہ تم گواہی دو پوری نوع انسانی پر اور ہمارے رسولؐ گواہی دیں تم پر۔" (البقرۃ۔ ۱۴۳)

اب گواہی دینے کا مفہوم کیا ہے؟ لفظ شہادت کے معنی کیا ہیں اور اصطلاحاً شہادت علی الناس سے کیا مراد ہے؟ اس وقت اس بحث میں پڑے بغیر صرف یہ سمجھ لیجئے کہ "شہادت علی الناس" کارِ رسالت اور فرائضِ نبوت کے لئے جامع ترین اصطلاح ہے۔ یعنی ابلاغ و تبلیغ اور عملی شہادت کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کر دینا اور اجتماعی سطح پر دین حق کی ایسی گواہی دے دینا کہ اللہ کے ہاں جا کر دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ پروردگار ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ تیرا دین کیا ہے' تو ہم سے چاہتا کیا ہے۔ اسی کے لئے انبیاء بھیجے گئے' اسی کے لئے خاتم المرسلینؐ آئے اور اب آپؐ پر ختم نبوت کے بعد یہ فریضہ بحیثیت مجموعی امت محمدیہؐ کے حوالے کر دیا گیا۔ گویا کہ یہ ہمارا مقصد وجود اور فرض منصبی ہے۔

۲۔ شہادتِ حق کا تقاضا..... اسی شہادت حق کا ایک تقاضا یہ ہے کہ دین کے اجتماعی نظام کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ لہٰذا بعثت محمدیؐ کی خصوصی غرض جو قرآن مجید میں تین مقامات پر آئی وہ یہ ہے کہ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

"وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الھدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے کل کے کل نظام اطاعت پر' کل کے کل دین پر' کل کے کل نظام زندگی پر۔" اور یہ کام حضورؐ نے کر کے دکھایا جس کی دشمنوں نے بھی گواہی دی' اپنوں نے تو خیر دینی ہی ہے کہ اس

سے بہتر نظام اجتماعی کبھی اس روئے ارضی پر قائم نہیں ہوا۔ اُس نظام اجتماعی کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا بھی امت کا فرض منصبی ہے۔

۳۔ امّتِ مسلمہ کی موجودہ حالت..... اللہ کی طرف سے امت مسلمہ پر ان دو فرائض کی تعیین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ امت اگر ان فرائض کو ادا کرے تو اللہ کو نہایت محبوب ہوگی، بہت چہیتی ہوگی، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس کے شامل حال ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اسے میسر رہے گی۔ اور اگر اہل امت یہی کام چھوڑ دیں تو پھر دنیا میں جیسے اور لوگ آباد ہیں ایسے ہی مسلمان آباد ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا کوئی خصوصی وعدہ اس امت مسلمہ کے ساتھ نہ نصرت کا ہے نہ تائید کا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ دو اور دو چار کی طرح کا قاعدہ ہے کہ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ بلکہ عام دستور یہ ہے کہ جو چیز اپنے مقصد وجود کو پورا نہ کرے اسے اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں یا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ قلم جو لکھ نہ سکے، اسے آپ جیب میں سجائے نہیں پھرتے۔ لہٰذا امت مسلمہ بھی اپنے فرض منصبی کو چھوڑ دینے کے باعث عذاب خداوندی کی ایک کیفیت میں گرفتار ہے۔ اب یہ بھی دنیا کی عام قوموں کی طرح ایک قوم بن گئی ہے۔ جس طرح انہیں اپنے دنیوی مفادات سے بحث ہے، اسی طرح کا معاملہ ان کا ہے۔ جس طرح ایک عام انسان، کسی ہندو، سکھ، پارسی یا عیسائی کو ساری فکر بس اپنی معاش، اپنے بال بچوں کی پرورش، اپنے گھر کی سجاوٹ اور اپنے فرنیچر اور ساز و سامان کی ہوتی ہے، ایسے ہی ایک مسلمان کے ذہن کے اوپر بھی بالکل یہی فکر سوار ہو گئی تو پھر کیا فرق رہ گیا سوائے نام کے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہم "مخذول" ہو چکے ہیں، تائید خداوندی اور رحمت خداوندی ہمارا ساتھ چھوڑ چکی ہے بلکہ اللہ تعالےٰ کی سزا ہم پر مسلط ہے۔ چنانچہ پوری دنیا میں ذلت و رسوائی ہمارے لئے ایک علامت (SYMBOL) بن چکی ہے۔ پوری دنیا میں کہیں بھی ہمارا باوقار اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے والا وجود نہیں ہے۔ ہم دوسروں کے دست نگر ہیں، ہماری پالیسیاں کہیں اور بنتی ہیں، ہمارے لئے معاشی نظام اور اس کے لئے بنیادی اصول بھی کہیں اور طے ہوتے ہیں۔ ہم یا تو اُن کے شکنجے میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا بال بال قرضے میں بندھا ہوا ہے، یا ہم نے انہیں اپنی دولت کا امین بنا رکھا ہے۔ عرب ممالک کے اربہا ارب ڈالر ان کے بنکوں میں رکھے ہوئے ہیں اور نتیجۃً وہ ان کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ یہ ہمارا حال ہے بحیثیت

مجموعی' لہٰذا وہ ذلت اور رسوائی جس کے لئے قران مجید میں ضربت عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُ وَبِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کے الفاظ کبھی سابقہ امت مسلمہ کے لئے استعمال ہوئے تھے' اگر آپ باریک بینی سے دیکھیں تو موجودہ امت مسلمہ بھی اسی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

۴۔ **پاکستان کا خصوصی معاملہ**..... پوری امت مسلمہ میں پاکستان کا معاملہ ؏ "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی" کے مصداق خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوا۔ لہٰذا یہاں معاملہ دوہرا ہے ؏ "جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے"۔ چنانچہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی دوہرا ہے۔ ایک تو پوری امت مسلمہ پر ذلت و رسوائی کا جو عذاب مسلط ہے اس میں ہم بھی گرفتار ہیں۔ اس کے علاوہ ہم پر دو اضافی عذاب نازل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک عذاب وہ ہے جو سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۶۵ میں بیان فرمایا گیا۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ

یعنی تمہیں گروہوں میں' طبقات میں تقسیم کر دے گا اور آپس میں ٹکرا دے گا۔ ایک دوسرے کی قوتیں ایک دوسرے پر استعمال ہوں گی۔ آج ہماری قومی زندگی جس انتشار سے دوچار ہے وہ یہی نقشہ پیش کر رہی ہے۔ وہ ایک مسلمان قوم جس نے ایک بنیان مرصوص ہو کر ہندو اور انگریز دونوں کی خواہشات کے علی الرغم پاکستان حاصل کیا تھا' آج وہ قومیتوں میں منقسم ہو چکی ہے۔ کہیں لسانی قومیتیں ہیں' کہیں صوبائی اور علاقائی قومیتیں ہیں کہیں قبائلی عصبیتیں ہیں۔ باقی مذہبی فرقہ واریت اور طبقاتی انتشار' امیر اور غریب کے درمیان رسہ کشی یہ اپنی جگہ ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ افقی اور عمودی دونوں سطحوں پر ہماری تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے۔ یہ وہ عذاب خداوندی ہے کہ جس کے لئے قرآن حکیم میں اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

دوسرا اضافی عذاب جس میں ہم مبتلا ہیں وہ درحقیقت عملی نفاق ہے۔ حضورؐ نے منافق کی چار علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ اذا حدّث کذب' واذا وعدا خلف' واذا اؤتمن خان' واذا خاصم فجر..... یعنی جب بولے جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے' جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے اور جب اختلاف ہو جائے تو آپے سے باہر

ہو کر گالی گلوچ پر اتر آئے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جس میں یہ چاروں ہیں وہ کٹر منافق ہے اور ایک ہے تو گویا اسی حساب سے ۲۵ فیصد منافق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اس کی عملی تفسیر ہمارا معاشرہ ہے۔ نفاق کی ان علامتوں میں سے وہ کونسی ہوگی جو ہمارے اندر نہیں پائی جاتی۔ اس وقت ہم شدید اخلاقی بحران سے دوچار ہیں۔ نفاق کے اس عذاب کی وجہ کیا ہے؟ اس کے لئے میں نے بارہا سورۃ التوبہ کی آیات کا حوالہ دیا ہے کہ جب کوئی گروہ یا کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص وعدہ کرے اور پھر اس وعدے کی خلاف ورزی کرے تو اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ اس قوم کے اندر نفاق پیدا کر دیتا ہے۔ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ..... (پس اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا) تو یہ ہے صورتحال اُمت مسلمہ اور خاص طور پر وطن عزیز پاکستان کی! ویسے اگر اس کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے حالات کن اعتبارات سے خراب ہیں اور کن کن پہلوؤں سے تشویش ناک اور مایوس کن ہیں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ لیکن اگر قرآن مجید سے اس کی توجیہہ دریافت کریں گے' اس کا سبب معلوم کرنا چاہیں گے تو اس کا لبِّ لباب میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ گزشتہ خطابات جمعہ میں اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔

موجودہ صورتِ حال کے خوش آئند پہلو

اللہ کے فضل و کرم سے

مایوسیوں کے ان گھٹاٹوپ اندھیاروں میں اس وقت ملکی سطح پر سیاسی اور قومی اعتبار سے چند چیزیں ایسی بھی ہوئی ہیں جو بڑی امید افزا ہیں۔ ہماری توجہ ان اچھی چیزوں کی طرف بھی رہنی چاہئے تاکہ مایوسی کا پلڑا بہت زیادہ جھک نہ جائے۔ اگر مایوسی کا پلڑا زیادہ جھک جائے تو انسان میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں رہتی' اس کے اعضاء اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں اور قوتِ عمل جواب دے جاتی ہے۔

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد..... گزشتہ تیس سال کے عرصے سے ہماری قومی سیاست اس مسموم دائرہ خبیثہ (VICIOUS CIRCLE) کے اندر چکر کاٹ رہی ہے کہ ہر مرتبہ کوئی آمر حکومت پر مسلط ہو جاتا ہے اور پھر دائیں اور بائیں بازو کی

تمام سیاسی جماعتیں' خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر سب جمع ہو کر اس کی ٹانگ گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا متحدہ محاذ بنتا ہے اور یہ متحدہ محاذ جب تحریک چلاتا ہے تو توڑ پھوڑ' ایجی ٹیشن' ہنگامہ آرائی اس کا لازمی حصہ ہوتا ہے' جس کے نتیجے میں وہ آمر بہرحال معزول ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ کوئی اور سیاسی عمل پختہ بنیادوں پر موجود نہیں لہٰذا کچھ عرصہ کے بعد پھر اختلال پیدا ہوتا ہے اور ملکی اور قومی سطح پر پھر کسی آمر کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی آمریت کا تخت جما کر بیٹھ جائے پھر وہی چکر چلتا ہے پھر سب لوگ جمع ہو کر اس کی ٹانگ گھسیٹتے ہیں' پھر وہی ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اس چکر میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کوئی بیرونی یا اندرونی دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھالے جائے۔ چنانچہ آپ کو یاد ہو گا کہ ہمارے ہاں یہ تشویش بار بار پیدا ہوئی ہے کہ یہ ملک باقی رہے گا یا نہیں!

گزشتہ تیس سالوں میں جو سیاسی صورتحال دو مرتبہ پیدا ہو چکی تھی' اب پھر تیسری مرتبہ اس کے لئے فضا تیار ہو چکی تھی۔ اب صدر ضیاء الحق صاحب کے خلاف عوامی سطح پر ایک اتحاد کی خاطر مذہبی و لادینی سیاسی پارٹیاں باہم گٹھ جوڑ کر رہی تھیں۔ ایم آر ڈی تو خیر جو تھی سو تھی' لیکن اب بقیہ جماعتیں بھی اسی نہج کے اوپر سوچ رہی تھیں۔ ان سب کا پھر ایک متحدہ محاذ وجود میں آتا' پھر وہی رسہ کشی ہوتی' پھر وہی عوامی تحریک چلتی اور وہی توڑ پھوڑ اور ہنگامے ہوتے۔ اس میں شدید اندیشہ تھا کہ ہمارے بیرونی دشمن جو اس وقت سب سے زیادہ تاک میں اور دھاک میں بیٹھے ہوئے ہیں اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ایک طرف روس اور دوسری طرف بھارت ہماری سالمیت کے بدترین دشمن ہیں اور دونوں کا بڑا گہرا باہمی گٹھ جوڑ ہے۔

دونوں کو پاکستان کی طرف سے ہمیشہ سے شدید تشویش لاحق رہی ہے۔ اب مسئلہ افغانستان' سے انکی فکر اور تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اگر وہاں پر مجاہدین کی مستحکم حکومت قائم ہو جائے تو روس کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ یہ بھی ہے کہ روسی ترکستان میں جو پانچ سات کروڑ مسلمان آباد ہیں' ان کا وہاں پر مسلط روسی نظام کے خلاف ایک تحریک برپا کر دینا ایک لازمی امر ہے۔ افغانستان میں ایسے عناصر کی حکومت جنہیں بنیاد پرست (FUNDAMENTALISTS) کہا جاتا ہے اگر مستحکم ہو جائے تو ہندوستان کا خطرہ بھی دوچند ہو جاتا ہے' اس لئے کہ وہ نہ تو احمد شاہ ابدالی کو بھولے ہیں' نہ محمود غزنوی کو اور نہ ہی شہاب الدین غوری کو۔ اسی طرح چاہے خاندان غلاماں کے حکمران ہوں' چاہے خاندان مغلیہ کے یا لودھی خاندان کے سب وہیں سے ہندوستان میں آئے۔ ہندوستان کے ہندو اس طویل تاریخ کو کس طرح

فراموش کر سکتے ہیں۔ یہ خطہ تو ان کے ذہنوں پر کابوس کی طرح سوار ہے۔ وہاں اگر خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو بھارت کی تو نیند اچاٹ ہو جائے۔

سانحۂ بہاولپور کے بارے میں یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن غالب قرائن اسی بات کے حق میں ہیں کہ یہ عظیم حادثہ انہی دونوں کے گٹھ جوڑ سے ہوا ہے۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ پاکستان کو غیر مستحکم (DESTABILIZED) کر دیں۔ ان حالات میں اگر کہیں وہ تحریک چلتی تو میرے نزدیک وہ معاملہ بڑے خوفناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ یہ تو ہم پر اللہ کا ایک بہت بڑا احسان ہوا ہے کہ اس وقت وہ معاملہ اس طور سے ختم ہو گیا۔ اللہ نے صدر ضیاء الحق صاحب کو انتہائی قابل رشک موت عطا فرمادی جو دنیوی اور اخروی دونوں اعتبارات سے ان کے لئے انتہائی باعزت اور قابل احترام بھی ہو گئی اور وہ منظر سے بھی ہٹ گئے۔ اور جو صورت حال اس قسم کی کسی تحریک کی کامیابی کے بعد ہوتی وہ اس وقت ملک میں پیدا ہو گئی۔ تو میرے نزدیک یہ بھی اللہ کی رحمت کا ایک مظہر ہے کہ اس توڑ پھوڑ، ایجی ٹیشن اور ہنگامے سے ملک محفوظ رہا۔ صدر ضیاء الحق صاحب تو صاف کہتے تھے کہ اُن کا حلقۂ انتخاب فوج ہے۔ تو اگر کہیں خدانخواستہ وہ تصادم ہو جاتا تو گویا کہ براہ راست فوج کی محاذ آرائی عوام کے ساتھ ہوتی۔ یہ معاملہ ہمارے لئے انتہائی خوفناک نتائج کا حامل ہونا تھا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے اور اس شر سے اللہ نے ہمارے لئے ایک خیر برآمد کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

"اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو درآنحالیکہ اس میں تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور اس میں تمہارے لئے شر ہو۔" وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ "اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" فارسی کا ایک بڑا عمدہ مصرع ہے ؎

عدو شرے برانگیزد کہ خیرِ ما دراں باشد

یعنی دشمن ہمارے لئے شر کا اہتمام کرتا ہے، فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہے کہ وہ اسی کو ہمارے حق میں خیر بنا دیتا ہے۔ کبڑے کو کسی نے زور سے لات ماری تو اس کی کوب نکل گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی قدرتوں کے مظاہر ہیں۔ اگرچہ ہمارے لئے یہ حادثہ انتہائی افسوسناک ہے اور جس درجہ میں اس پر افسوس اور تاسف کا اظہار

کیا گیا ہے وہ یقیناً ایک مثالی شے ہے اور پاکستان کی تاریخ میں اس کی مثال شاید قائداعظم کے انتقال کے بعد کسی شخصیت کے بارے میں نہ ملے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمن کے اس شر کے اندر سے ہمارے لئے خیر برآمد کر دیا کہ اس دائرہ خبیثہ (VICIOUS CIRCLE) کا جو خطرناک ترین موڑ لامحالہ آنے والا تھا' اسے خود ہی ختم کر دیا اور جو صورت اس کے بعد پیدا ہونی تھی وہ اس وقت پیدا ہو گئی۔

ضیاء مرحوم کی وفات سے پیدا شدہ خلا کے منفی اثرات سے بچے رہنا

دوسری بڑی ہی خوش آئند بات یہ کہ یہ بھی یقیناً اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے کہ صدر ضیاء الحق صاحب کی اتنی گھمبیر شخصیت کے اٹھ جانے سے جو اتنا مہیب خلا پیدا ہوا ہے' اس کے بھی اس ارض پاکستان پر کوئی منفی اثرات مترتب نہیں ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح اور قائد ملت لیاقت علی خان دونوں کو ذرا ایک طرف رکھ دیجئے تو اتنی گھمبیر شخصیت ہمارے ہاں کوئی اور نہیں آئی۔ یعنی ایک طرف فوج ان کی پشت پر' فوج ان کی CONSTITUENCY' اور آخری دم تک چیف آف آرمی سٹاف کی وردی ان کے جسم پر موجود تھی۔ ثانیاً ہمارے ملک کے سیاسیین کا ایک دھڑا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اگرچہ خود انہوں نے سیاسی لوگوں کے بارے میں کبھی کوئی کلمۂ خیر نہیں کہا' بلکہ وہ تو سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کا تذکرہ انتہائی تحقیر آمیز انداز میں کرتے رہے۔ ایک ایرانی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ یہ سیاست دان کیا ہیں' ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں جب انہیں بلاؤں گا یہ دم ہلاتے ہوئے میرے پاس آ جائیں گے۔ بہرحال ہمارے یہاں سیاست دانوں کی ایک جنس ہے' جو کہ ہر صاحب اقتدار کے آگے پیچھے رہتے ہیں' اس کا کلمہ پڑھتے ہیں اور اس کا دم بھرتے ہیں۔ ضیاء الحق کے اندر تو پھر بھی ذاتی شخصیت و کردار کے اعتبار سے بہت ساری باتیں ایسی موجود تھیں جو قابل مدح تھیں' لیکن یہاں تو اگر کوئی شخص ان اوصاف سے بالکلیہ خالی ہو تو تب بھی اس کے گلے میں ہار ڈالنے والے موجود ہیں۔ بہرحال ان سیاست دانوں کا بھی ایک مضبوط دھڑا ان کے ساتھ تھا۔

پھر ہمارے ملک میں مذہب کا نعرہ سیاسی اپوزیشن کا ایک بہت بڑا ہتھیار رہا ہے۔ ایوب خان اور بھٹو کے خلاف چلنی والی تحریکوں میں سب سے مؤثر نعرہ یہی مذہب ہی کا تھا' لہٰذا پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) کی تحریک کو بھی تحریک نظام مصطفیٰ بننا پڑا۔ اس کے بغیر عوامی

اپیل حاصل نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ ہتھیار بھی اب ضیاء الحق صاحب نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اسے کسی اور سیاسی و مذہبی جماعت کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے ان کو بالکل نہتا کر کے رکھ دیا تھا۔ لہٰذا اتنی گھمبیر شخصیت اس وقت کوئی نہیں تھی اور نہ ہی مستقبل قریب میں کوئی توقع ہے کہ ایسی کوئی شخصیت سامنے آسکے۔ اب ان کے یکدم ہٹ جانے سے ایک بہت بڑا مہیب خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ اور واقعی ہمارے دشمنوں نے سمجھا تھا کہ اس سے پاکستان یکدم تہ و بالا ہو کر رہ جائے گا۔ اگرچہ ہم "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" کے مصداق اس حادثے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر کسی طرح بھی قیاس نہیں کر سکتے، لیکن ہم اپنے حالات کے لئے روشنی حاصل کرنے کے لئے دور صحابہؓ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ایرانی مجوسیوں نے یہ سمجھا تھا کہ حضرت عمرؓ کو شہید کر دیا جائے تو یہ تمام تانا بانا بکھر جائے گا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا، اللہ کا فضل شامل حال رہا اور وہ نظام برقرار رہا۔ اب کروڑ میں ایک کی نسبت سے ہی اپنے اس معاملے کو دیکھیں تو یہاں بھی اللہ کا بڑا فضل ہوا ہے کہ ارض پاکستان پر اتنے مہیب خلاء کے بعد بھی کوئی منفی اثرات مترتب نہیں ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت تھی کہ حالات کا دریا بڑی روانی اور عمدگی کے ساتھ بہتا رہا، جس پر پوری دنیا نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ دنیا تو اپنے ظاہری اسباب کے حوالے سے گفتگو کرتی ہے، لیکن ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ " لا مؤثر فی الحقیقۃ و لا فاعل الا اللہ " اللہ کے سوا نہ کوئی فاعل حقیقی ہے اور نہ ہی کوئی مؤثر حقیقی۔ تمام لوگوں کے دل اللہ کی انگلیوں کے مابین ہیں، جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ جو کچھ ہو رہا ہے اگرچہ اس کے ظاہری اسباب پر بھی گفتگو ہونی چاہئے کہ ہم عالم اسباب میں رہ رہے ہیں اور اسباب و علل کے ایک سلسلے میں بندھے ہوئے ہیں، لیکن ان تمام اسباب کے پیچھے مسبّب الاسباب کا ہاتھ کارفرما ہے۔ تو میرے نزدیک یہ رحمت خداوندی کا بہت بڑا مظہر ہے کہ ہم اپنے انتہائی دگرگوں اندرونی حالات اور تمام تر مذہبی و سیاسی انتشارات کے باوجود اس مہیب خلاء سے بخیر و خوبی گزر گئے ہیں، بلکہ صحیح تر الفاظ یہ ہوں گے کہ اللہ نے ہمیں گزار دیا ہے۔

میں نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں تصویر کے یہی دو رخ دکھائے ہیں کہ حالات و واقعات کو دیکھتا ہوں تو بہت مایوسی ہوتی ہے، لیکن یہ بھی نظر آتا ہے کہ مشیت ایزدی کا اس خطۂ ارضی کے ساتھ کوئی طویل المیعاد منصوبہ (LONG TERM PLAN) وابستہ ہے اور غلبۂ اسلام جو عالمی سطح پر ہو کر رہے گا، اس کی تحریک کے لئے شاید اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس

کی مشیت میں اس خطۂ ارضی کا انتخاب ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے کر اب تک گذشتہ چار سو برس میں جتنی بھی تجدیدی تحریکیں اٹھی ہیں وہ سب کی سب اسی سرزمین سے متعلق ہیں۔ پھر اسلام کے نام پر پاکستان کا معجزانہ قیام اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت و حکمت کا مظہر ہے۔ اگرچہ ۱۹۷۱ء میں ہماری پیٹھ پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برسا تھا اور یہ ملک دولخت ہو گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک یہ "مغربی پاکستان" بھی قائم ہے تو ہمارے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ کی خصوصی رحمت کے سہارے قائم ہے۔ اللہ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کے یہ دو بہت بڑے مظاہر جو سامنے آئے ہیں تو اس سے میری امید کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔

دو اہم شخصیتوں کا احساسِ ذمہ داری

تیسری خوش آئند بات یہ ہے کہ اس وقت دو اہم شخصیتوں نے جن پر بڑی ذمہ داری آ پڑی ہے، بڑا مثالی کردار ادا کیا ہے۔ ان کے دل میں اگر ذرا سی بھی اقتدار کی خواہش کروٹ لیتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کے جو حیوانی داعیات اور محرکات ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے۔ بلکہ نفسیات میں ایڈلر کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ انسان کے محرکات عمل میں سب سے قوی محرک غلبہ اور اقتدار کی خواہش اور حبِّ تفوّق ہے۔ ہم اس کے نظریئے کو تو درست تسلیم نہیں کرتے لیکن اس حد تک بات صحیح ہے کہ یہ خواہش نفس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ نئی پیدا شدہ صورت حال میں ایک طرف غلام اسحاق خان صاحب کو موقع ملا تھا کہ وہ کوئی ایسی شکل اختیار کرتے، جس سے اقتدار کو طول دیا جا سکتا۔ لیکن الحمد للہ کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا ہے۔ ان کی اس وقت کی نفسیاتی کیفیت میں ان کی ۷۴ برس کی عمر کو بھی دخل ہے اور اُن کے ملکی معاملات کے طویل تجربے کو بھی۔ بہرحال اب تک تو صورت یہی ہے، آئندہ کے لئے ہم یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل میں کوئی اس طرح کی امنگ پیدا نہ کر دے اور وہ اس ملک کو معروف معنوں میں دستوری پٹڑی کے اوپر ڈال سکیں۔ اسی طرح کا معاملہ ہمارے چیف آف آرمی سٹاف کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے کہ انہوں نے بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا ہے۔ افواہیں تو بہت ہیں اور معلوم نہیں کہ کس حد تک صحیح ہیں، بہرحال یہ تو اخبارات میں بھی آ چکا ہے کہ انہیں باقاعدہ اکسایا گیا ہے، لیکن الحمد للہ انہوں نے اس وقت تک اس رخ پر نہیں سوچا، بلکہ اس کے برعکس انہوں نے جو اپنی

پالیسی بیان کی ہے وہ اطمینان بخش ہے۔ تو میرے نزدیک یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور اس ملک کے مستقبل کے بارے میں اچھی امید دلانے والی باتوں میں سے ایک ہے۔

اب تک کی گفتگو میں میں نے آپ کے سامنے ایک طرف تو پاکستان کے موجودہ حالات کے منفی پہلو کا مختصراً تجزیہ پیش کیا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے' قرآن مجید کی رو سے اس کی تشخیص کیا ہے؟ اور دوسری طرف حالات کے جو امید افزاء پہلو ہیں وہ بھی میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔

سیاسی و مذہبی رہنماؤں کی خدمت میں چند مشورے

اب ان حالات میں میں سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی خدمت میں کچھ مشورے پیش کرنا چاہتا ہوں' جو میرا آج کا اصل موضوع ہے۔ اس کے ضمن میں میں سب سے پہلے عرض کر دوں کہ میرے بارے میں اب تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں۔ میں بہت پہلے یہ طے کر چکا ہوں کہ اس انتخابی سیاست کے میدان میں قدم رکھنا ہی نہیں۔ میں ۶۵ء/۶۶ء میں جب لاہور آیا تھا اُس وقت صدر ایوب خان کے خلاف فضا ہموار ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اُن دنوں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب خود چل کر کئی بار میرے کلینک میں آئے۔ یہ حنیف رامے صاحب اور عبداللہ ملک صاحب وغیرہ کے ساتھ ایک گروپ بنا کر سیاسی تحریک شروع کرنے کی سوچ رہے تھے۔ بعد میں اس گروپ نے بھٹو صاحب کے ساتھ منسلک ہو کر پاکستان پیپلز پارٹی کی شکل اختیار کی۔ انہوں نے دعوت دی تو اس وقت بھی میں نے اپنا ایک کتابچہ "اسلام کی نشأۃ ثانیہ' کرنے کا اصل کام" ان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا کہ جناب میں تو یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ پھر یہاں کتنے ہی موڑ آئے اور سیاست کی بہتی گنگا میں کتنے ہی لوگوں نے ہاتھ دھوئے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے کسی موڑ پر بھی کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ سیاست کے میدان میں دو چیزوں کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے' یعنی کچھ بولنے کی صلاحیت اور کچھ لکھنے کی صلاحیت' لیکن میں نے بفضلہ تعالیٰ یکسو ہو کر اپنی ان صلاحیتوں کو قرآن مجید کی دعوت کو عام کرنے میں لگایا ہے۔ پیش نظر کیا تھا؟ دین کا انقلابی تصور سامنے آجائے اور غلبۂ دین جو مقصدِ بعثتِ محمدیؐ ہے' اس کے لئے تن' من' دھن سے جہاد اور جدوجہد کرنے کی آرزو اور جذبہ پیدا ہو جائے۔ اور یہ قرآن ہی سے ہو گا' کسی اور کے اپنے

فلسفے سے یا کسی کی تصانیف سے نہیں ہو گا۔ قرآن ہی اس کے لئے منبع اور سرچشمہ ہے۔ تو یہ میرا مقصد تھا جس کے لئے میں لگا رہا۔ پھر جو لوگ عہد کریں کہ اس مقصد کے لئے تن، من، دھن لگا دیں گے، ان کو منظم کرنے کے لئے تنظیم اسلامی قائم کی۔ میں آج تک کسی سیاسی میدان میں نہیں آیا اور آئندہ کے لئے بھی یہی عزم ہے کہ انتخابی سیاست میں تو قدم ہی نہیں رکھنا ہے۔

البتہ جیسا کہ بارہا عرض کیا ہے کہ اس ملک کے شہری ہونے کے اعتبار سے مجھے اس کی بھلائی مطلوب ہے۔ دنیوی اعتبار سے بھی کہ اسی سرزمین پر میرا گھروندہ ہے اور اسی سے میری اولاد کا مستقبل وابستہ ہے اور دینی اعتبار سے بھی، اس لئے کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق بھی مشیت ایزدی میں اسی خطۂ ارضی کے ساتھ ہے اور اس ملک کی جڑ اور بنیاد اسلام کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اس ملک کی خیر خواہی میں مشورہ دینا میں نے ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے اور اس کے لئے میرے سامنے جو اصولی ہدایت ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے جس میں دین کی تعلیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: الدین النصیحۃ یعنی دین تو نام ہے خیر خواہی کا، اخلاص کا، وفاداری کا، دوسروں کی بھلائی چاہنے کا۔ ہمارے ہاں لفظ نصیحت صرف ایک معنی میں آتا ہے کہ کسی کو اچھی بات کہنا، نصیحت کرنا، لیکن عربی میں اس کا اصل مفہوم خلوص اور اخلاص ہے۔ آپ کسی کو نصیحت بھی کرتے ہیں تو جب تک آپ کے دل میں اس کی خیر خواہی نہیں ہوگی، آپ کی بات نصیحت شمار نہیں ہوگی۔ تو حضورؐ نے فرمایا ہے کہ دین تو اصل میں نام ہی نصیحت کا ہے یعنی خلوص و اخلاص اور وفاداری و خیر خواہی کا۔ قیل لمن یا رسول اللہ۔ سوال کیا گیا کہ حضورؐ کس سے خلوص و اخلاص اور وفاداری؟ کس کی خیر خواہی؟ بڑی پیاری بات ہے جو حضورؐ نے جواب میں فرمائی۔ یہ پورے دین کا ایک خلاصہ ہے۔ آپ نے فرمایا: للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتہم۔ یہ خلوص و اخلاص اور وفاداری سب سے پہلے اللہ کے ساتھ۔ ہمارا یہ دین دینِ توحید ہے۔ اس کی جڑ بنیاد ہی ایمان باللہ ہے۔ پھر اللہ کا کلام ہے جو گویا کہ اس کی صفت ہے۔ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ یہ ہمارے اور اللہ کے درمیان زندہ رابطہ ہے، یہ حبل اللہ ہے، اس کے ساتھ وفاداری۔ پھر وہ ہستی جس پر یہ نازل ہوئی، جس نے ہمارے لئے ہر اعتبار سے اپنا اسوۂ حسنہ چھوڑا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

وفاداری۔ اس کے بعد فرمایا گیا: و لائمۃ المسلمین۔ اور مسلمانوں کے جو امام ہوں 'جو ان کی قیادت کر رہے ہیں 'جن کی طرف لوگ رہنمائی کے لئے دیکھتے ہوں ان کی خیر خواہی۔ ائمۃ المسلمین سیاسی بھی ہو سکتے ہیں اور دینی بھی۔ ہر مسجد کے اندر ایک امام ہوتا ہے 'جو آگے ہوتا ہے اور مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ تو یہ امامت صرف سیاسی امامت نہیں ہے بلکہ اس کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ مسلمانوں کے معاشرے میں 'ان کی ملی زندگی کے اندر 'جو لوگ بھی کسی اعتبار سے نمایاں حیثیت کے حامل ہوں اور لوگ ان کی پیروی کرتے ہوں 'اور ان سے رہنمائی اخذ کرتے ہوں وہ ان کے ائمہ ہیں۔ و عامتہم..... اور مسلمان عوام جو ہیں ان سب کے ساتھ بھی خلوص و اخلاص اور وفاداری۔ چنانچہ یہ ہے در حقیقت وہ جذبہ جس کے تحت میں یہ باتیں کہہ رہا ہوں۔

مروّجہ پارلیمانی نظام سیاست کو برقرار رکھیے!

سب سے پہلے میں سیاست کے بارے میں چند باتیں اور اہل سیاست کو کچھ مشورے عرض کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ مروجہ پارلیمانی سیاست ہماری ماضی کی تاریخ کے ساتھ بھی وابستگی رکھتی ہے 'اسی کے ذریعے سے پاکستان وجود میں آیا اور اسی کا ہماری قوم کو کچھ تجربہ بھی ہے۔ لہٰذا بحالات موجودہ اس سے انحراف کی کوئی کوشش انتہائی خوفناک ہو سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے بہتر کوئی اور نظام نہیں ہے۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا نظام جو ہے صدارتی نظام سے قریب تر ہے لیکن موجودہ حالات میں مناسب ترین یہی ہے کہ مروّجہ پارلیمانی نظام میں کہیں کوئی بنیادی تبدیلی فوری طور پر نہ لائی جائے۔ کوئی بنیادی تبدیلی کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں آ سکتی ہے 'جس کے لئے پہلے اس کا فلسفہ پیش کرنا ہو گا اور اس کے حق میں دلائل دینے ہوں گے۔ بدقسمتی سے ماضی قریب میں کچھ لوگوں نے صدر ضیاء الحق صاحب کو بڑی غلط پٹیاں پڑھائیں اور غلط فلسفے ان کے ذہن میں ڈالے 'جس کی وجہ سے انہوں نے اس پارلیمانی نظام سیاست کو خلاف اسلام سمجھ لیا کہ اسلام کا نظام کچھ اور ہے۔ وہ کیا ہے؟ اس کی بھی کوئی تعریف 'کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شدید کنفیوژن پیدا ہو گیا۔ تو اب جبکہ ضیاء الحق صاحب تو منظر سے ہٹ گئے ہیں از سر نو اس بحث کو نہیں اٹھانا چاہئے۔ جن لوگوں نے ان کو یہ پٹیاں پڑھائیں ان میں سے ایک صاحب

اس وقت بھی وزارت کے منصب پر فائز ہیں۔ ان کا عجیب نقشہ میرے سامنے آیا کہ ابھی جب یہ مطالبہ کیا گیا کہ انتخابات سے قبل نگران حکومتیں اور وزارتیں ختم کر دی جائیں یا کم سے کم یہ طے کر دیا جائے کہ جو وزارت پر ہو گا' وہ الیکشن میں حصہ نہیں لے گا تو ان صاحب نے دہائی دی کہ دنیا میں کہاں یہ اصول ہے؟ حالانکہ یہ وہی صاحب ہیں جو دنیا کی کسی بات کو ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ سیاسی جماعتوں کے قیام کو بھی خلاف اسلام سمجھتے ہیں' اور جماعتی سیاست کو کفر قرار دیتے ہیں' لیکن چونکہ حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے اس وقت وہ وزیر ہیں لہٰذا اب دہائی دے رہے ہیں کہ دنیا میں تو کہیں اس کا رواج نہیں ہے۔ تو یہ ہے ہماری ژولیدہ فکری اور ہمارے قول و عمل کے تضاد کا عالم! اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ چونکہ خود پاکستان کا وجود میں آنا بھی مروّجہ پارلیمانی سیاست ہی کا مرہون منت ہے اور اسی نظام سیاست کو لے کر چلنے کی کچھ صلاحیت اور کچھ تجربہ اس قوم کو حاصل ہوا ہے لہٰذا اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔

جماعتی سیاست خلافِ اسلام نہیں ہے

دوسری بات یہ کہ میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں کہ اس میں ہرگز کوئی شے خلاف اسلام نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جب الازہر کے ریکٹر یہاں آئے تھے تو اسی قسم کے بزرجمہر جو یہاں موجود ہیں' جنہوں نے صدر ضیاء صاحب کو نئے نئے فلسفے پڑھائے تھے' انہوں نے ان سے فتویٰ لینے کی کوشش کی تھی کہ یہ جماعتی سیاست اور سیاسی جماعتوں کا قیام خلافِ اسلام ہے۔ انہیں کچھ لوگوں کی طرف سے فتوے مل بھی گئے تھے اور انہوں نے بڑے پرامید انداز میں چاہا تھا کہ ایک ہزار سالہ علمی تاریخ کے حامل' عالم اسلام کے قدیم ترین دارالعلوم کے ریکٹر اور شیخ الازہر سے اگر یہ فتویٰ مل جائے تو کیا کہنے ہیں! لیکن اللہ کا شکر میں نے اس وقت بھی ادا کیا تھا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی بلکہ صاف کہا تھا کہ سیاسی جماعتوں کا قیام اور جماعتی بنیادوں پر سیاست کا چلانا ہرگز خلاف اسلام نہیں ہے۔ میرا یہ انشراحِ صدر پہلے بھی تھا کہ یہ خلاف اسلام نہیں ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے اعتبار سے اس سے بہتر کوئی شے ہو سکتی ہے۔ یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ کونسی چیز بہتر ہے اور کونسی کم تر ہے لیکن میرے نزدیک اس وقت یہ بحث چھیڑنے کا بھی موقع نہیں ہے' اس لئے کہ کوئی بہتر شے لانے کے لئے کسی انقلابی عمل کی ضرورت ہو

گی۔ اس کے بغیر اس کا ذکر کرنا خالصتاً ذہنی انتشار پیدا کرنا ہے' جو ملک وملت کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہے۔

دو مضبوط اور مستحکم جماعتوں کا وجود ناگزیر ہے

تیسری بات یہ جان لیجئے کہ اس مروجہ پارلیمانی نظام کی ایک لازمی شرط (PRE- REQUISITE) یہ ہے کہ دو بڑی بڑی مضبوط اور مستحکم سیاسی جماعتیں میدان میں موجود ہوں۔ اور اگر ایک ہی جماعت رہ جائے تو پھر آمریت پیدا ہو جائے گی خواہ کوئی بھی ہو' پیپلز پارٹی ہو یا مسلم لیگ۔ جب انا و لا غیری (میں اور میرے سوا کوئی نہیں) کی کیفیت ہوتی ہے' جب انسان دیکھتا ہے کہ کوئی اس کے مقابل نہیں' کوئی اس کا محاسبہ کرنے والا نہیں' کوئی مضبوط حزبِ مخالف نہیں تو اس کے اندر آپ سے آپ مقتدر اور مقتدر مطلق بننے کی خواہشات انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ لہٰذا کسی کے اندر اس قسم کے خنّاس کو پیدا ہونے سے روکنے کے لئے اور اس پارلیمانی نظام کے بخیر و خوبی چلنے کے لئے دو مضبوط و مستحکم سیاسی جماعتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ ایسی عوامی قومی جماعتیں ہونی چاہئیں جن کا مؤقف اور نقطۂ نظر بہت زیادہ مختلف نہ ہو' ورنہ تو وہ انقلابی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ ان دونوں جماعتوں کے اندر انتہا پسندی نہ ہو بلکہ ان کے مابین فرق اس اعتبار سے ہو کہ جدید اصطلاح میں ایک کو LEFT OF THE CENTRE اور ایک کو 'RIGHT OF THE CENTRE' کہا جا سکے۔ اس کی مثال برطانیہ کے پارلیمانی نظام میں بھی ہے اور امریکہ کے صدارتی نظام میں بھی۔ ہمارا نظام برطانوی پارلیمانی نظام کا چربہ ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کی دو بڑی جماعتوں' کنزرویٹو پارٹی اور لیبر پارٹی کے نظریات و افکار میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کنزرویٹو پارٹی ذرا سا دائیں طرف ہے اور لیبر پارٹی ذرا سا بائیں طرف ہے۔ باقی ان کے مابین نہ قوم پرستی کی بنیاد پر کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی وہاں کی دستوری روایات میں قطعاً کوئی اختلاف ہے۔ اختلاف ہو گا تو کچھ مالی معاملات میں اور کچھ امیگریشن پالیسی وغیرہ کے بارے میں اس لئے کہ گاڑی ٹھیک طور سے تب ہی چل سکتی ہے جب اس کے دونوں پہیے متوازی ہوں اور قریب قریب ہوں۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ میں اگرچہ صدارتی نظام ہے لیکن وہاں بھی دو پارٹیز ہیں اور کوئی لمبا چوڑا فرق و اختلاف ان میں نہیں ہے۔ ایک طرف ری پبلکن ہیں جنہیں آپ 'RIGHT OF THE CENTRE' کہہ سکتے ہیں اور

دوسری طرف ڈیموکریٹس ہیں جنہیں آپ ' LEFT OF THE CENTRE ' کہہ سکتے ہیں اور میں اب جو بات کہنے والا ہوں اس کی شہادت آپ کو بے نظیر بھٹو صاحبہ کی اس دعا سے مل گئی ہوگی جو اخبار میں شائع ہوئی ہے کہ کاش امریکہ کے انتخاب میں ڈیموکریٹس جیت جائیں۔ یہ وہی ' LEFT OF THE CENTRE ' والی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جو رجحان اپنا ہوگا اسی کے لئے پسندیدگی باہر بھی ہوگی۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اب تک تو ایسی کوئی شکل تھی ہی نہیں۔ کوئی سیاسی جماعت یہاں مستحکم نہیں تھی۔ ابتدا میں مسلم لیگ تھی جو بہت جلدی انتشار کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ پھر اسی کے بطن سے سہروردی کی عوامی لیگ بر آمد ہوئی' پھر اسی سے ممدوٹ شاہ کی جناح لیگ بر آمد ہوئی اور پھر نہ معلوم اس کے کیا کیا حصے بخرے ہوئے۔ کنونشن لیگ' کونسل لیگ اور قیوم لیگ اور اب تو پتہ نہیں کتنی لیگیں ہیں۔ وقت پڑنے پر مختلف سیاسی جماعتوں کے اتحاد بن جاتے ہیں۔ کچھ لیڈر جن کے بارے میں صحیح کہا تھا ضیاء الحق صاحب نے کہ تانگے کی سواریاں ہیں' ان کے بیانات آتے ہیں' وقت کے اوپر جمع ہو جاتے ہیں اور بیچ میں کوئی مذہبی نعرہ شامل کر کے تحریک چلا لیتے ہیں۔ اس کے سوا ہماری کسی بھی جماعت کو کوئی سیاسی سٹینڈنگ حاصل نہیں ہے اب ایک خوش آئند تبدیلی یہ محسوس کی جا سکتی ہے کہ ضیاء الحق صاحب کے دورِ اقتدار کے گیارہ برس کے دوران پیپلز پارٹی نے ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اپنے ' CREDENTIALS ' بہت مستحکم کر لئے ہیں۔ پاکستان میں اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں تھی کہ کوئی سیاسی پارٹی نہ صرف یہ کہ حکومت سے باہر رہ کر بلکہ وقت کی مضبوط ترین حکومت کی اولین دشمن شمار ہو کر اور اس کے خلاف ساری قوت بروئے کار آنے کے باوجود قائم رہ گئی۔ یہ واقعتاً بہت بڑی بات ہے۔ اگرچہ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے لیکن پھر بھی اس کا قائم رہ جانا میرے نزدیک پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے اور پارلیمانی سیاست کی پہلی لازمی شرط کے اعتبار سے ایک امید افزا بات ہے اسی کے ساتھ ایک اور پہلو شامل کیجئے کہ الحمدللہ پیپلز پارٹی کا اب وہ جوشیلا اور ہنگامہ برپا کرنے والا انداز' وہ پہلی سی انتہا پسندی اور سوشلزم کے ساتھ وہ انتہائی وابستگی' یہ سب کچھ اب برقرار نہیں رہا۔ صورتِ حال رفتہ رفتہ یہاں آ گئی ہے کہ اب یہ کوئی انتہائی بائیں بازو کی پارٹی نہیں رہی۔ میرے اندازے میں یہ درمیان میں آ چکی ہے' اگرچہ اس کا رجحان

بائیں بازو کی طرف ہے اور اب آپ زیادہ سے زیادہ اسے LEFT OF THE CENTRE کی پارٹی کہہ سکتے ہیں۔ ان کا وہ انتہا پسندی والا رجحان اب ختم ہو چکا ہے اور بے نظیر صاحبہ نے بڑی بڑی یقین دہانیاں کروائی ہیں، باہر بھی، اندر بھی، فوج کو بھی، سرمایہ داروں کو بھی، طرح طرح سے اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے کہ ؎

میرے اس دور کو اب قصۂ ماضی سمجھو![1]

وہ دور اور تھا، اب ہم کچھ اور ہیں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ یقین دہانیاں نتیجہ خیز ہوں گی اور ان کی پارٹی ہمارے ملک میں ایک LEFT OF THE CENTRE پارٹی کی حیثیت میں کام کرے گی۔

دوسرا ایک عمدہ نکتہ جو سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کی صفوں میں بھی ایک معجزہ رونما ہو گیا ہے۔ جونیجو صاحب جس طرح ذلیل و خوار کر کے کوچۂ اقتدار سے نکالے گئے، جس طرح وقت کی گھمبیر ترین شخصیت نے ان کے خلاف الزامات لگائے اور جس بڑے پیمانے پر ان کی کردار کشی کی گئی، اس کے باوجود ان کا کھڑا رہ جانا، پھر یہ کہ ان کا شریفانہ انداز اختیار کئے رکھنا اور جواباً کوئی اشتعال انگیزی کا ثبوت نہ دینا، یہ بھی بڑی امید افزا بات ہے۔

ان کا پہلا ردِ عمل تو یہی تھا کہ ٹھیک ہے ان کا دستوری حق تھا، اگر انہوں نے برخاست کر دیا تو یہ ایک دستوری اقدام تھا۔ بعد میں اگرچہ انہیں خیال آیا کہ یہ بات میں نے کچھ زیادہ آگے کی کہہ دی ہے لیکن انہوں نے کوئی گالم گلوچ کی شکل اختیار نہیں کی، کوئی جذباتی ہنگامہ آرائی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور پھر ایک شخص جو اس طرح سے ایوانِ حکومت سے نکال باہر کر دیا گیا ہو، مسلم لیگ کے کچھ مؤثر عناصر کا اس کے ساتھ جڑا رہ جانا واقعتاً بہت بڑی بات ہے۔ چاروں صوبائی لیگیں جو حکومت میں ہیں یہ ابھی اس ٹیسٹ سے نہیں گزری ہیں۔ ان میں جو لوگ ہیں وہ اگر حکومت سے نکل جانے کے باوجود کھڑے رہ جائیں تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے اپنے اس سیاسی ٹیسٹ میں اپنی اہلیت ثابت کر لی ہے۔ لیکن چاروں صوبائی ذی اقتدار شخصیتوں کی متحدہ کوشش کے باوجود جونیجو صاحب کا اپنی جگہ پر کھڑے رہ جانا اور ان کے پہلے کنونشن کا کامیابی سے منعقد ہو جانا میرے نزدیک یہ مسلم لیگ کی صفوں میں ایسا معجزہ

---

[1] اکبر الٰہ آبادی مرحوم شعر دراصل یوں ہے:-

میرے اسلام کو اب قصۂ ماضی سمجھو! ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی ماضی سمجھو!

ہے' جو ایک عرصے کے بعد رونما ہوا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے یہاں دو جمعوں میں مسلم لیگیوں کے لئے دعا کرائی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں متحد ہونے کی توفیق عطا کرے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کہیں یہ صورت نہ ہوئی اور موجودہ صورت حال میں اقتدار پیپلز پارٹی کے پاس آگیا تو وہ بے راہ ہو جائیگی اور پھر اس کو روکنے' تھامنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ چنانچہ ملکی سیاست کو متوازن رکھنے اور صحیح رخ پر چلانے کے لئے کم سے کم دو مضبوط جماعتوں کا وجود ضروری ہے۔ اور اسی طرح سے پارلیمانی سیاست کا ایک لازمی تقاضا پورا ہو سکتا ہے۔

دائیں اور بائیں کی بنیاد پر نئی الائنمنٹ کیسے ہونی چاہیے

آپ لوگ محسوس کر رہے ہوں گے کہ کسی آمرانہ شخصیت کے میدان سے ہٹنے کے بعد ہمارے ہاں جو صورت ہوا کرتی تھی ——— اب اس کے آثار دوبارہ پیدا ہو چکے ہیں۔ ضیاء صاحب کی موجودگی میں جو الائنمنٹ ہو رہا تھا وہ اب ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ وہ کوئی اور صورت حال تھی جس میں کچھ جماعتوں کے درمیان مفاہمتوں کی فضا پیدا ہوئی تھی۔ اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اب ہمارے ہاں جو POLARIZATION ہو گی وہ لیفٹ اور رائٹ کی بنیاد پر ہو گی۔ ان حالات میں سیاسی جماعتوں کے لئے میرا مشورہ کیا ہے' اس کو سمجھئے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ مسلم لیگ کو توفیق دے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے گروپ مدغم ہو کر ایک مضبوط سیاسی جماعت بنائیں۔ ظاہر بات ہے کہ مسلم لیگ اسلام کی نام لیوا جماعت ہے اور پاکستان اسی کی جدوجہد سے وجود میں آیا تھا' چنانچہ اس طریقے سے یہ ایک مضبوط RIGHT OF THE CENTRE جماعت بن سکے گی۔ ایئر مارشل اصغر خان صاحب پیپلز پارٹی کی نسبت زیادہ بائیں طرف ہیں' ان کے نظریات کچھ زیادہ انقلابی ہیں لیکن کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے ——— انہوں نے بھی اب تک بڑی محنت کی ہے۔ میں ان کی محنت کا قائل ہوں' میں ان کے حبِّ وطن کا قائل ہوں۔ پھر یہاں کے معاشی نظام کے اندر جو واقعتاً بہت زیادہ اونچ نیچ ہے' وہ چاہتے ہیں کہ اس میں ایک معتدل صورت پیدا ہو جائے۔ انتظامی ڈھانچے کے اندر بھی وہ چاہتے ہیں کہ بنیادی تبدیلی لائیں تاکہ زیادہ فطری سطح پر عوام کی شرکت ہو۔ ان کی جماعت نے بہت کچھ ہوم ورک بھی کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ واحد سیاسی جماعت ہے جس نے ہمارے مختلف معاشی اور سیاسی مسائل کے اوپر گروپ بن کر کام کیا

ہے، لیکن یہ ان کا اپنی علیحدہ ڈفلی بجانا اور اپنا علیحدہ راگ الاپنا اس نے پہلے بھی بہت سے مراحل پر کافی نقصان پہنچایا تھا اور اب بھی یہ طرز عمل مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنا SOLO FLIGHT والا دور بھی پورا کر لیا ہے اور اس سے حاصل کچھ نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ قومی سیاست میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے اصل شے قیادت کا ایثار ہے۔ سیاسی پارٹیوں میں کوئی قیادت ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتی۔ اب یہاں قائداعظم جیسی قیادت تو کسی کی نہیں۔ کوئی بھی نہیں کہ جو اس طرح کی صلاحیتوں کا مالک ہو کہ ان کی موجودگی میں کسی کا بھی چراغ نہ جل سکے۔ لہٰذا میرے نزدیک ان کے لئے بھی بہترین شکل یہ ہوگی کہ وہ یا تو پیپلز پارٹی کے ساتھ مدغم ہو جائیں یا اس سے اشتراکِ عمل کر لیں۔ مذہبی عناصر کے بارے میں اگرچہ تفصیلاً تو میں بعد میں عرض کروں گا لیکن میری خواہش یہ ہے کہ جو بھی مذہبی جماعتیں، مذہبی گروہ یا مذہبی شخصیتیں سیاست کے میدان میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہوں وہ بھی ان دو میں سے کسی ایک کو اپنے رجحان کے مطابق چن لیں۔ میرے سامنے سب سے بڑی مثال مسلم لیگ کی ہے۔ قائداعظم اس معنی میں کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے، جس معنی میں ہمارے ہاں ایک مذہبی آدمی کا تصور ہے۔ مسلم لیگ کی صف اول کی قیادت بھی کوئی اس طرح کے مذہبی لوگوں پر مشتمل نہیں تھی، لیکن کیسی کیسی عظیم شخصیتوں اور کیسے بڑے بڑے علماء و مشائخ نے ان کا ساتھ دیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا عبدالحامد بدایونیؒ جیسی علمی اور پیر جماعت علی شاہ صاحبؒ جیسی روحانی شخصیتوں نے ان کا ساتھ دیا تو وہ قومی سیاست کسی ایک نتیجے تک پہنچ سکی۔ اگر سب اپنی علیحدہ علیحدہ ٹکڑیاں بانٹ کر رکھتے تو کبھی بھی پاکستان کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اس وقت جو لوگ بھی قومی سیاست کے دھارے میں آنا چاہیں ان کو بھی اپنا علیحدہ تشخص اور علیحدہ ٹکڑیاں بنا کر رکھنے کی بجائے کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنا رجحان دیکھیں اور دائیں یا بائیں جدھر بھی ہو ان میں شامل ہوں تاکہ اس ملک کے اندر دو مضبوط سیاسی جماعتیں وجود میں آ جائیں جو مروّجہ پارلیمانی سیاست کی شرط لازم ہے۔

اس سے ذرا آگے چلئے تو دائیں اور بائیں دونوں طرف انتہاپسند (EXTREMISTS) ہیں دائیں طرف مذہبی جماعتیں ہیں جن میں سے بعض انتہاپسند ہیں۔ بائیں طرف جو انتہاپسند ہیں وہ آپ کو معلوم ہے کہ نیشنلسٹ، کمیونسٹ اور سوشلسٹ ہیں۔ پاکستان میں نیشنلزم

کاسب سے بڑا گڑھ صوبہ سرحد ہوا کرتا تھا' جہاں پر پختون قومیت کا نعرہ لگتا تھا' بلوچستان میں نیشنلزم کے علاوہ کمیونزم بھی بڑی سائنٹفک بنیادوں پر ابھر رہا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب نیشنلزم کاسب سے بڑا گڑھ سندھ بن گیا ہے۔ وہاں پر پلیجو اور جام ساقی وغیرہ سندھی قوم پرستی کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں اور قوم پرستوں کا بادشاہ جی ایم سید بھی وہیں سرگرم عمل ہے۔ چنانچہ وہاں بڑی ہی تشویش ناک صورت حال پیدا ہو چکی ہے اور اگر قومی سیاست کے دھارے کے یہ جو دو اہم حصے ہیں یہ مضبوط نہ کئے گئے تو شدید انتشار کا خطرہ ہے' جس سے فائدہ اٹھائیں گے یہی بائیں بازو کے انتہا پسند لوگ جو یہاں پر مارکسزم' سائنٹفک کمیونزم یا 'CESSATIONISM' کے علمبردار ہیں اور پاکستان کو توڑنے کے عزائم کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

مذہبی رہنماؤں سے چند خصوصی گزارشات

اب میں چند باتیں مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں اور مذہبی شخصیات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے ہی قدم پر میں عرض کر دوں کہ مجھے بڑا خوف ہے کیونکہ اہلِ سیاست تو خود بھی کھلی بات کہتے ہیں اور انہیں کھلی بات سننے کی عادت بھی ہوتی ہے لیکن مذہبی رہنماؤں کے ہاں ع

ہشدار کہ رہبر دم تیغ است قدم را

کے مصداق بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں اتنے کھلے دل کے ساتھ بات سننے کی روایت اتنی زیادہ موجود نہیں ہے۔ پھر حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں جو جماعتیں یا جو شخصیات ہیں ان میں سے بہت سوں سے مجھ کو بڑی گہری محبت ہے۔ ان کا ادب و احترام تو ہے ہی' لیکن اس سے بڑھ کر مجھے ان سے عقیدت کے درجے تک محبت ہے۔ اس کے باوجود کچھ باتیں بہرحال کہنی ضروری ہیں کہ مجھے اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو کھول دے اور کم سے کم کھلے دل کھلے ذہن کے ساتھ میری بات پر غور کرنے کے لئے ہی تیار ہو جائیں۔ یہاں وہ بات بھی دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجئے جو میں نے پچھلی مرتبہ بھی عرض کی تھی کہ مجھے جس سے جتنی زیادہ توقع ہوتی ہے' یہ توقع پوری نہ ہونے پر اس کے بارے میں اتنی ہی زیادہ شکایت ہوتی ہے اور اس کے بارے میں میری گفتگو میں' میری تحریر و تقریر

میں اتنی ہی زیادہ تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا کہ میری تلخی کو آپ ان کے ساتھ میری محبت کے راست متناسب (DIRECTLY PROPORTIONAL) سمجھئے! چنانچہ ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

انقلابی جدوجہد یا انتخابی کشمکش ؟

دینی جماعتوں کے لئے میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ وہ خدا کے لئے شعوری طور پر خوب سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کریں کہ انہیں دینی انقلابی رخ پر کام کرنا ہے یا قومی سیاسی رخ پر کام کرنا ہے۔ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ ان دونوں کاموں کے تقاضے بالکل جدا اور بالکل مخالف ہیں میں نے پچھلی مرتبہ تین چیزیں تفصیل سے عرض کی تھیں کہ اگر آپ کو خالص دینی اور انقلابی کام کرنا ہے اور اسلام کو غالب کرنا ہے تو پہلا قدم ہو گا تصحیح عقائد۔ یعنی جو صحابہؓ کرامؓ کا سادہ صحیح اور اوہام وغیرہ سے پاک عقیدہ تھا وہ لوگوں میں پیدا کیجئے۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چلے گی۔ دوسری شرط لازم یہ ہے کہ جو اس میدان میں کام کرنے کے لئے آئیں وہ خود دین پر عمل پیرا ہوں۔ اگر وہ خود نماز تک نہ پڑھتے ہوں تو وہ دین کو قائم کرنے کا کام کیسے کر سکیں گے؟ تیسرے یہ کہ پھر ان کی جو جماعت بنے وہ بھی چار آنے کی ممبری والی جماعت نہ ہو بلکہ اس میں صرف وہی لوگ شامل کئے جائیں جو کم سے کم فرائض کو ادا کرنے والے ہوں، رزق حلال پر قانع اور حرام سے بچنے والے ہوں۔ پھر یہ جماعت ایک منظم اور سمع وطاعت والی جماعت ہو۔ اور اس میں CADRES کا تعین ان کے خلوص واخلاص، تقویٰ وتدین اور قربانیوں کی بنیاد پر ہو نہ کہ ان کی ذات برادری، سرمایہ داری اور چودھراہٹ، یا زمینداری اور جاگیرداری کی بنیاد پر ہو، تو اگر خالص دینی اور وہ بھی انقلابی نہج پر دینی کام کرنا ہے تو یہ تین چیزیں اس کے لوازم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قومی سیاست میں مذہبی عناصر کا کردار

اس کے برعکس اگر آپ کو قومی سیاست میں کوئی مؤثر رول ادا کرنا ہے تو اولاً یہاں عقائد

کی بحث مت چھیڑیئے۔ یہ بحث یہاں زہر قاتل ہو جائے گی یہاں تو صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جذباتی محبت کی بات ہونی چاہئے۔ اسی بنیاد پر تو مسلم لیگ کی تحریک اٹھی تھی۔ وہاں عقائد کی بحث بالکل نہیں چھیڑی گئی۔ ثانیاً یہاں عمل کو بھی بالکل چھوڑ دیجئے۔ ہر کلمہ گو مسلمان ہے' فاسق بھی مسلمان' فاجر بھی مسلمان' گناہ کبیرہ کا مرتکب بھی کافر نہیں' مسلمان ہے۔ اگر آپ عمل کی بحث کو لے آئے تو آپ نے اپنا BASE پہلے ہی محدود کر دیا۔ اب آپ آگے کیا بڑھیں گے؟ مسلم لیگ کی تحریک میں نعرہ تھا ؎ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کوئی بھی ہو' کسے باشد' نہ عقیدے سے بحث ہو گی نہ ہی اس کے کردار و عمل سے بحث ہو گی۔ ثالثاً یہ کہ میدان کھلا رکھئے کہ حوصلہ مند لوگ آئیں اور آپ کی جماعت کو وسعت حاصل ہو اور اس میں سکہ رائج الوقت جو ہے اس کی بڑی قدر و قیمت ہے' اسے اپنی مٹھی میں لیجئے۔ سکہ رائج الوقت کیا ہے؟ سرمایہ داری' کوئی جاگیرداری اور زمینداری' کوئی سجادہ نشینی یا اس کے ساتھ کوئی وابستگی' یا کسی قبیلے کی سرداری یا کسی بڑی برادری کی چودھراہٹ! تو جس کے پاس یہ سکہ رائج الوقت ہے' اگر اسے آپ اپنی جماعت میں نہ آنے دیں اور سیاست بھی کرنا چاہیں تو گویا کہ آپ تضادات کا شکار ہیں۔ ان کو موقع دیں' وہ آئیں اور ان میں سے بہتر کا انتخاب کر لیجئے۔ یعنی جو اپنی حیثیت کے اعتبار سے بہتر ہوں' نہ کہ کردار کے اعتبار سے۔ اگر اب بھی یہ دیکھنا ہے کہ ان میں سے جس کا کردار بہتر ہے اس کو آگے آنا چاہئے تو پھر اس وادی میں کاہے کو قدم رکھنا ہے ؎ "جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟" خوب اچھی طرح سے جان لیجئے کہ قومی سیاست کے تقاضے کچھ اور ہیں اور دینی' خصوصاً انقلابی سیاست کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ لہٰذا اس میں اول تو شعوری طور پر یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں اِدھر جانا ہے یا اُدھر جانا ہے۔ جب تک یہ فیصلہ نہیں ہو گا کنفیوژن رہے گا' وہی ہو گا کہ کچھ اِدھر کچھ اُدھر۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اس کیفیت کے ساتھ بعض دینی جماعتیں اس وقت بری طرح دوچار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے کہ وہ اس معاملہ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ میرے نزدیک سیاست گناہ نہیں ہے اور میں نے ہمیشہ کہا ہے کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء بنو اسرائیل کی سیاست تو انبیاء کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس وقت تو یہ سیاست ہمارے لئے بہت بڑی ضرورت بن گئی ہے۔ پاکستان کے بقا کے لئے شرط لازم ہے کہ یہاں مضبوط' مستحکم اور صحتمند سیاست کی بنیادیں قائم ہو جائیں

ورنہ وہی انتشار اور اضمحلال کی کیفیت رہے گی اور دشمن کی دراندازی کا خطرہ موجود رہے گا۔ اس اعتبار سے اس وقت اگر سیاست کے میدان میں کوئی مؤثر رول ادا کیا جاسکے تو یہ بھی میرے نزدیک کرنے کا ایک کام ہے' اگرچہ میری ترجیحات میں یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ میری ترجیحات میں اوّلیت انقلابی نہج پر اسلام کے لئے کام کرنے کو ہے اور میں اسی میں لگا ہوا ہوں۔

بہرحال مذہبی عناصر میں سے جو لوگ یہ طے کرلیں کہ انہیں سیاست ہی کے میدان میں اپنا رول ادا کرنا ہے تو انہیں حبِّ وطن اور اسلام پسندی والا مثبت کردار ادا کرنے کے لئے اس کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ مسلم لیگ بھی اسلام پسند سیاسی جماعت تھی۔ اس کا نعرہ تھا پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ اس میں اگرچہ کچھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے لیکن ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ پہلے نمبر پر وہی لوگ تھے جو اسلام کے ساتھ قلبی اور جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بظاہر چاہے مذہبی نظر نہیں آتے تھے لیکن ان کی تہذیب و تمدن میں اسلامی روایات موجود تھیں۔ اس اعتبار سے کچھ مذہبی عناصر اگر سیاسی میدان میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیں تو یہ میرے نزدیک کوئی گھٹیا کام نہیں ہے۔ البتہ اس کی ایک شرط لازم ہے اور وہ یہ کہ کسی مذہبی سیاسی جماعت کی بنیاد فرقہ بندی پر نہیں ہونی چاہئے۔ یہ بنیاد انتہائی مہلک ہے۔ فرقے اور مسلک کے حوالے سے کرنے کے کام اور ہیں۔ ان کے لئے اگر ادارے قائم ہوں' انجمنیں اور جماعتیں بنیں تو کوئی حرج نہیں' لیکن سیاست کا میدان اس کے لئے موزوں نہیں۔ سیاست میں جب اسلام کے نام پر مذہبی عناصر تقسیم ہو جاتے ہیں تو اس کا سارا فائدہ سیکولر اور کمیونسٹ عناصر کو پہنچتا ہے۔ ہمارا دو دفعہ کا تجربہ اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ جماعت بندی کی بنیاد فرقہ اور مسلک سے بالاتر ہونی چاہئے۔

قومی سیاست کو فرقہ بندی سے پاک رکھیے

مزید یہ کہ سیاسی پلیٹ فارم پر فرقے اور مسلک کی بات سرے سے ہونی ہی نہیں چاہئے۔ میں فقہی مسالک کی نفی نہیں کر رہا۔ اگر کسی کی ترجیحات میں اولین شے اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت ہے تو وہ تبلیغی میدان میں کام کرے۔ اس کے لئے دارالعلوم اور انجمنوں کی سطح پر کام ہو سکتا ہے' لیکن ان بحثوں کو سیاسی میدان میں ہرگز نہ لائیے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ

ایک زمانے میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ کراچی سے ایک مہم لے کر نکلے تھے انہوں نے پورے پاکستان کا دورہ کیا اور مختلف شہروں میں جا کر ایک بات کی تلقین کی کہ ہمیں یہ طے کر لینا چاہئے کہ فرقے اور مسلک کی بات اور مذہبی اختلاف کی بحث یا تو صرف اپنے مدرسے میں ہو یا اپنی جو مساجد ہیں ان کے منبر سے ہو۔ کبھی اجتماع عام میں اور پبلک پلیٹ فارم سے مذہبی اختلاف کی بات نہیں آنی چاہئے۔ مفتی صاحبؒ نے یہ کتنی صحیح بات کہی تھی جو اگرچہ صدا بصحرا ثابت ہوئی، لیکن آج اس کا تذکرہ کر کے ہمیں ان کے لئے دعائے خیر کرنی چاہئے۔ مفتی صاحبؒ نے اُس وقت پبلک پلیٹ فارم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں یہاں سیاسی پلیٹ فارم کا لفظ استعمال کر رہا ہوں کہ اس پلیٹ فارم سے ایسی بات نہیں ہونی چاہئے کہ جو تقسیم کرنے والی ہو۔ قومی سیاست میں ان چیزوں سے بالاتر ہو کر لوگوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔

جماعتِ اسلامی کا المیہ

میرے ماضی کے اعتبار سے میرے نزدیک اہم ترین دینی جماعت جماعت اسلامی ہے۔ یہ واحد جماعت ہے جو انقلابی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ کسی اور جماعت کے اندر رکنیت کی وہ شرائط نہیں ہیں جو اس کے ہاں ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے دستور کے اندر عقیدے کی پوری وضاحت اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی معیّن تعبیر بھی درج ہے ـــــ ـــــ گویا کہ کسی کے پاس اس کے خلاف کچھ ہے تو وہ اس جماعت میں نہیں آسکتا۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے تقسیم ہند سے پہلے مسلمانانِ ہند کی سیاست سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور اس نے صرف ہندوستان ہی کے نہیں فلسطینی مسلمانوں کے مسائل کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ ان کا تجزیہ یہ تھا کہ ہمارے تمام قومی امراض اور جملہ مسائل کا واحد سبب اسلام سے دوری ہے، اور ان کا واحد حل اسلام کے ساتھ عملی وابستگی اور اپنے فرض منصبی کو پہچان کر اسے ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونا ہے۔ پھر ان کا تنظیمی ڈھانچہ بھی انقلابی طرز کا تھا اور لٹریچر بھی انقلابی تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اپنے مزاج کی ساخت کے اعتبار سے یہ ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت تھی۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ ابھی تک انقلابی طرز کا ہے اور میرے نزدیک یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس نے اس تنظیمی ڈھانچے کو انتخابی سیاست کے میدان میں ڈال کر خود

بھی نقصان اٹھایا اور اس ملک کو بھی نقصان پہنچایا۔ اس پر میں نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے اُس انٹرویو میں جو "ندا" کے ایک پینل نے مجھ سے لیا تھا اور جو "ندا" کے ستمبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ جماعت اسلامی کے اس انتقالِ مؤقف کے ہماری قومی اور ملی سیاست پر جو نقصانات مترتب ہوئے 'ان پر میں نے اپنی کتاب "اسلام اور پاکستان" میں بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔

اس جماعت کے بارے میں میری خواہش 'میری دلی آرزو اور تمنا جسے میں اس کے عوام و خواص کی خدمت میں درخواست کی صورت میں پیش کر رہا ہوں کہ خدارا اپنی موجودہ پالیسی پر نظرِ ثانی کریں اور اپنے اصل طریق کار 'یعنی انقلابی نہج کو اختیار کرتے ہوئے 'انتخابی سیاست کے میدان سے دست کش ہو جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی انقلابی مشینری کو انتخابی سیاست کے میدان میں استعمال کر کے خود اپنے اوپر بھی ظلم ہے اور اس مشینری پر بھی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کے لئے پورے خلوص اور جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ طے کر لیں کہ آئندہ انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس ایک فیصلے کے دو عظیم فائدے انہیں حاصل ہوں گے

انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کے دو عظیم فائدے

ایک یہ کہ اس ملک کے عام اسلام پسند لوگ انتخابی سیاست کے میدان میں دینی جماعتوں کی باہمی رسہ کشی کے باعث اسلام کے مستقبل کے بارے میں جس درجے شدید مایوسی کا شکار ہو چکے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دین و مذہب کے اعتبار سے ہمارے زوال و انحطاط کا اصل سبب دین دار اور دین پسند لوگوں کے ووٹوں کا تقسیم ہو جانا ہے 'اس تأثر میں یک دم نمایاں کمی واقع ہو جائے گی اور اس خوشگوار تبدیلی کا سارا کریڈٹ جماعت اسلامی کو جائے گا جو آئندہ کے لئے انقلابی عمل میں ان کے لئے ایک بہت بڑا سرمایہ (ASSET) بن سکتا ہے۔ میں یہ باتیں جماعت کے ذمہ دار حضرات سے ملاقاتیں کر کے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پبلک پلیٹ فارم پر خطاب عام میں کہہ رہا ہوں کہ اس کا جماعت کو واقعتہً بہت بڑا فائدہ حاصل ہو گا۔

آئندہ انتخابات سے کنارہ کش ہونے کے فیصلے کا دوسرا اہم تر فائدہ جماعت اسلامی کو

یہ پہنچے گا کہ سیاست کے میدان میں موجود دیگر مذہبی جماعتیں کوشش کریں گی کہ جماعت اسلامی کے ساتھ اپنے معاملات درست کریں۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ جماعت اسلامی کے زیر اثر ووٹروں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ لہٰذا وہ اپنے حق میں جماعت کے خیر سگالی کے جذبات حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوں گی۔ نتیجۃً ہمارے معاشرے میں سرایت شدہ فرقہ واریت کے زہر کی تلخی میں نمایاں کمی واقع ہو گی اور جماعت کے لئے موقع ہو گا کہ وہ اس سلسلے میں نیو کلیس بن کر ایک مؤثر کردار ادا کر سکے۔ جب جماعت اسلامی انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے نہیں کرے گی تو ظاہر ہے کہ اس کے ووٹ تو انہی لوگوں کو جائیں گے جو دین کے علمبردار ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر ہم نے طے کر رکھا ہے کہ تنظیم اسلامی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی، لیکن ہمارے ساتھی جب ووٹ دیں گے تو ان کے سامنے دو معیارات ہوں گے۔ اولاً یہ کہ جس شخص کو ووٹ دینا ہے وہ پابندِ شریعت ہو۔ اگر کوئی شخص خدا کا وفادار نہیں ہے تو وہ ہمارا اور اس ملک کا وفادار کہاں سے ہو جائے گا؟ ہم اس کو اپنا ووٹ دے کر اللہ کے ہاں اس کی بداعمالیوں میں حصہ دار نہیں بننا چاہتے۔ حدیث میں آیا ہے۔ من مشی مع فاسق لیقو یہ غضب اللہ تعالیٰ و اھتزلہ العرش۔ جو شخص کسی فاسق کے ساتھ اسے تقویت پہنچانے کے لئے چلتا ہے، اللہ اس پر اتنا غضب ناک ہوتا ہے کہ اس کا عرش تھرا اٹھتا ہے تو ووٹ دینے سے بڑی تقویت اور کیا ہو گی؟۔ ثانیاً یہ کہ جس شخص کے حق میں ووٹ دینا ہے اس کا تعلق کسی ایسی جماعت سے نہ ہو جس کے منشور میں کوئی شے خلاف اسلام ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خود تو پابندِ شریعت ہے لیکن ایسا سادہ لوح ہے کہ جدید سیاست کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتا ——

اور کسی ایسی جماعت کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہا ہے جس کے منشور میں کوئی چیز خلاف اسلام ہے تو اسے بھی ہم ووٹ نہیں دیں گے۔ تو اگر جماعت اسلامی بھی یہی مؤقف اختیار کرے تو نہ صرف یہ کہ ان کے ووٹ اسلام ہی کے حق میں استعمال ہوں گے، بلکہ اسلام پسند عناصر ان کے قریب آنے کی کوشش کریں گے اور یہ مذہبی سطح پر لوگوں کے لئے مرجع بن سکیں گے۔

یہ دو نقد فائدے ہیں جو اس ایک فیصلے سے جماعت اسلامی کو حاصل ہوتے ہیں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ بصورت دیگر اگر جماعت اسلامی الیکشن میں حصہ لینے کی پالیسی ہی پر عمل پیرا رہتی ہے تو اس بار بھی وہی ہو گا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ گنتی کی چند سیٹیں جو انہیں حاصل

ہوتی رہی ہیں معمولی کمی بیشی کے ساتھ وہی آئندہ بھی ان کے حصے میں آئیں گی۔ میں نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے چند روز قبل عید الفطر کے دن یہ عرض کیا تھا کہ مغربی پاکستان میں آپ کو چار یا پانچ سیٹیں ملیں گی اور مشرقی پاکستان میں آٹھ سے دس تک مل سکتی ہیں۔ مغربی پاکستان کی حد تک تو میری بات حرف بحرف درست ثابت ہوئی کہ چار امیدوار جماعت کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے جبکہ پانچویں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب تھے جو جماعت کی حمایت سے کامیاب ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ووٹوں کی گنتی کے اعتبار سے جماعت کا معاملہ مغربی پاکستان سے بہتر تھا' لیکن سائیکلون کی تباہی سے پیدا شدہ اثرات اور اس کے ضمن میں بی بی سی کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کے طوفان کے باعث صورتحال یکدم بدل گئی تھی۔ آئندہ انتخابات میں بھی کسی بڑے اتار چڑھاؤ کی توقع کرنا نادانی ہے۔ جماعت اسلامی کے اکابرین سے میری گزارش ہے کہ وہ ناپ تول کر فیصلہ کریں کہ ان کے نزدیک چند سیٹیں زیادہ وقیع ہیں یا وہ دو عظیم فائدے جن کا حوالہ میں دے چکا ہوں۔

قومی سیاست میں جمعیت اہلحدیث کا منفی طرز عمل

اس کے علاوہ باقی مذہبی جماعتوں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے مجھے کچھ نہیں کہنا۔ دو جماعتیں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ اور جمعیت اہلحدیث اصولاً میری بحث کے دائرے سے خارج ہیں' ان میں سے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے بارے میں تو خاص طور پر میں اس لئے بھی کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اس میں شیعہ سنی کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ ویسے بھی وہ جماعت نہیں تحریک ہے۔ ان کا انداز انقلابی ہے اور پھر ان کا الیکشن میں حصہ لینا بھی ابھی غیر یقینی ہے۔ البتہ جمعیت اہلحدیث سے مجھے شدید شکایت ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو خالص مذہبی فرقہ واریت کی بنیاد پر سیاست کر رہی ہے اگرچہ جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان کی بنیادوں میں بھی فرقہ واریت ہی ہے' لیکن نام میں فرقہ واریت نہیں ہے۔ یہاں تو نام ہی میں فرقہ موجود ہے دھڑلے کے ساتھ اہلحدیث مسلک کی بنیاد پر سیاست کی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بڑا منفی عمل ہے اور بہت ہی مضر ہے۔ اہلحدیث کو اہلحدیث کی حیثیت سے کام کرنا ہے تو وہ اپنے عقائد اپنے مسلک کی تبلیغ کریں' اپنے دار العلوم بنائیں' لیکن مسلک کی بنیاد پر سیاست میں آنا اس ملک کی جڑوں کو کھودنے کے مترادف ہے۔ چونکہ مجھے ان کے ساتھ دلچسپی اور محبت ہے اس لئے میں نے انہیں ذرا تلخ انداز سے مخاطب کیا ہے۔

جمعیّت علمائے اسلام اور جمعیّت علمائے پاکستان کے لیے صحیح تر راستہ

جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان الحمدللہ کہ ان دونوں کے نام میں فرقہ واریت نہیں ہے' لیکن دونوں کا تعلق دیوبندی اور بریلوی مسلک سے ہے۔ یہ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ سیاسی اعتبار سے بڑا مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں دیہات میں خاص طور پر عوام میں جو روایتی جذباتی مذہب چلا آرہا ہے وہ بریلویت نہیں۔ بریلویت توکل کی شئے ہے۔ ہمارے ہاں سیال شریف' گولڑہ شریف' تونسہ شریف اور اسی طرح کی دوسری گدیوں کی جڑیں بڑی پرانی ہیں۔ بریلویت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج کل ان کے درمیان کچھ اشتراک ہو گیا ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان یا جماعت اہل سنت وغیرہ کے لئے عوام کے اندر اپیل موجود ہے لیکن ہے وہ اپنے مسلک کی بنیاد پر۔ اسی طرح جمعیت علمائے اسلام کے لئے دیوبندیت کی بنیاد پر مذہبی اپیل موجود ہے۔ ان میں تھانوی حضرات بھی ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا' باقی جن کا قلبی اور ذہنی اور روحانی رشتہ مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہے۔ وہ تحریک پاکستان کے مخالف تھے لیکن عوامی سطح پر ان کا کافی اثر ورسوخ ہے۔ یہ دونوں جماعتیں سیاست میں ایک مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان کے لئے سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اتحاد کی توفیق دے اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں اس لئے کہ حنفیت ان کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ ان کی فقہ ایک' ان کے عقائد ایک ہیں۔ سارا فرق شخصیتوں کے ٹکراؤ کا ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے درمیان جو قلمی رسہ کشی اور مناظرے ہوئے ہیں بعض مسائل پر اس نے سارا تلخی کا زہر گھولا ہے اور ان سے ذرا پہلے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیر آبادیؒ کے مابین جو کچھ معاملات میں بحث وتمحیص ہوئی تھی وہ اس کے پس منظر میں ہے۔ ورنہ دونوں حنفی ہیں' دونوں کے عقائد وہی ماتریدی عقائد ہیں' امہات کتب ایک ہی ہیں۔

اگر تو یہ جمع ہو جائیں تو واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے اندر یہ بہت بڑا سیاسی کردار ادا کر سکتے ہیں اور میں اس کے کچھ آثار بھی دیکھ رہا ہوں۔ مولانا سمیع الحق صاحب کا کراچی جانا اور مولانا نورانی میاں سے ملاقات کرنا بہت اہم ہے۔ کچھ نہ کچھ ضرورت کا احساس ہو رہا ہے' اس لئے کہ جو نئی سیاسی قوتیں ابھر کر آگئی ہیں علاقائی قومیتوں کی بنیاد پر یا لسانی قومیتوں کی بنیاد پر انہوں

نے ایک بہت ہی 'COMMON THREAT' رکھ دیا ہے سب کے سامنے۔ مشترک دشمن بھی بسا اوقات ایک عارضی اتحاد پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں لیکن میں تو کہتا ہوں کہ یہ مثبت بنیادوں پر جمع ہوں۔ اسلام کے لئے کوئی اسلام لیگ بنالیں (اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے) اور پھر اگر دوسری جماعتیں میدان سے ہٹ جائیں تو ایک بہت بڑی قوت وجود میں آسکتی ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر یہ دائیں بائیں جدھر ان کا رجحان ہے ادھر کے اصل سیاسی دھارے میں مدغم ہو جائیں یا ایک گہرے تعاون کی شکل اختیار کرلیں جیسا کہ تحریک پاکستان کے دور میں تعاون تھا دیوبندیوں میں سے بھی تھانوی حضرات کا اور تقریباً تمام بریلوی مکتب فکر اور تمام مشائخ کا مسلم لیگ کے ساتھ۔ اگر اس وقت ایسا ہو سکتا تھا تو اب کیوں نہیں ہو سکتا' جتنا بڑا خطرہ اس وقت تھا اس سے بڑا خطرہ اب ہے' جس سے پاکستان آج دوچار ہے۔ اِس وقت ہندوستان ہم سے بیس گنا بڑی طاقت بن چکا ہے' روس ایک بہت بڑے خطرے کا نشان بن کر ہمارے سروں پر موجود ہے اِس وقت بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اُس وقت اگر ہندو کے مقابلے میں مسلمان جمع ہو گئے تھے مسلم لیگ کی قیادت میں تو آج کیوں نہیں ہو سکتے۔ اب میں آپ سے اپنے دل کی بات کہہ دوں' جمعیت علماء اسلام خاص طور پر مولانا فضل الرحمان گروپ' بڑی محبت ہے مجھے ان لوگوں سے' انہیں میں انقلابی مانتا ہوں وہ بھی کاش کہ انقلاب کا راستہ اختیار کرلیں' اس کے لوازم پورے کریں۔ یا پھر ان میں بائیں بازو کی طرف ایک رجحان موجود ہے۔ یہ زیادہ عوامی لوگ ہیں' ان میں کبھی وڈیرے لوگ شامل نہیں ہوئے' اسلام کے قانونی نظام کے اندر جتنا بھی سوشلزم آسکے اس کے یہ لوگ قائل ہیں۔ جمعیت علماء ہند کے بڑے بڑے علماء میں بھی یہ رجحان موجود تھا اور آپ کو یاد ہو گا بھٹو صاحب کے ساتھ الائنمنٹ کس کی ہوئی تھی' مولانا مفتی محمودؒ کی۔ باقی تمام علماء تو جمع ہو گئے تھے' بھٹو کے خلاف فتوے بھی انہوں دیئے تھے لیکن مولانا مفتی محمود کہاں کھڑے تھے۔ وہ درحقیقت ایک پس منظر ہے ایک مزاج ہے۔ اس کی مناسبت سے یا وہ انقلابیت کی طرف آئیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے میری ترجیح تو یہی ہے۔ ورنہ یہ کہ بائیں بازو کے ساتھ مل کر قوم کے سیاسی دھارے میں اپنا مثبت کردار ادا کریں۔

_____ مولانا نورانی میاں کی مذہبی فرقہ واریت پر مبنی سیاست مجھے بہت ہی ناپسند ہے لیکن سیاسی معاملات میں ان کی دُور اندیشی' اُن کی معاملہ فہمی کا میں بے انتہا

قائل ہوں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ پاکستان میں جتنے لوگ، جتنی جماعتیں، جتنی مذہبی شخصیتیں سیاست کے میدان میں ہیں ان میں مولانا نورانی میاں اپنی بالغ نظری اور وسیع النظری کے سبب سب سے بڑھ کر ہیں۔ پوری دنیا میں وہ چکر لگاتے ہیں اِن کے والد مرحوم نے پورے گلوب کے دو چکر لگائے تھے اسلام کی تبلیغ کے لئے۔ مولانا عبدالعلیم صدیقیؒ اگرچہ خانوادۂ بریلی سے منسلک تھے لیکن جب قومی معاملہ آیا تو انہوں نے خانوادۂ بریلی کے حکم کو نہیں مانا ان کا حکم تھا کہ تحریک خلافت میں شریک مت ہو لیکن ان کے والد مولانا عبدالعلیم صدیقی تحریک خلافت میں شامل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کا ایک پس منظر ہے۔ شریعت محاذ میں شرکت کے وقت بھی میں نے واضح کیا تھا کہ اس میں شامل دینی جماعتوں کے سیاسی مؤقف سے مجھے اختلاف ہے۔ میرا سیاسی مؤقف تو وہ ہے جو مولانا نورانی کا ہے لیکن شریعت محاذ میں ہم صرف دینی بنیادوں پر شامل تھے۔ میں واقعۃً یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا نورانی میاں اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں یا یہ کہ جمعیت علماء اسلام کے ساتھ مل کر مذہبی بنیادوں پر ایک نئی سیاسی جماعت قائم کر لیں تو وہ ایک مذہبی مزاج کے "قائداعظم" بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی بات کہہ دی ہے اور اب مجھے اس کا کوئی حصہ اگلے جمعہ پر مؤخر یا ملتوی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم و لسائر المسلمات

الحمدللہ کہ بلحاظ آبادی پاکستان کے تیسرے بڑے شہر اور عظیم صنعتی مرکز

فیصل آباد میں

ڈاکٹر اسرار احمد کے ماہانہ درسِ قرآن

کا آغاز جمعہ ۳۰ ستمبر کو ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں آیۃ بر کے درس سے ہو چکا ہے اور اب یہ درس، ان شاء اللہ ہر انگریزی ماہ کے آخری جمعہ کو بعد نماز مغرب اسی مقام پر ہوگا۔ چنانچہ آئندہ درس ان شاء اللہ العزیز، جمعہ ۲۸ اکتوبر ۸۸ء کو ہوگا جس میں ڈاکٹر صاحب

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی روشنی میں

'حکمتِ قرآنی کی اساسات'

بیان فرمائیں گے ——— ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"

طلبہ کے مسائل اور اُن کا حل

ڈاکٹر اسرار احمد

امیرِ تنظیمِ اسلامی و سابق ناظمِ اعلیٰ' اسلامی جمعیتِ طلبہ پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد کی اس تقریر کا خلاصہ جو موصوف نے نومبر ۱۹۵۳ء میں اسلامی جمعیتِ طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک جلسۂ عام میں کی تھی جو جہانگیر پارک کراچی میں ڈاکٹر عمر حیات ملک (مرحوم) سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور و وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔

یہ تقریر اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان نے تو بنگلہ زبان میں کتابی صورت میں شائع کی تھی لیکن مغربی پاکستان میں جمعیت کی بعد کی قیادت نے اسے لائقِ اعتناء نہیں سمجھا تھا ـــــ 'طلبہ تنظیمِ اسلامی' کے پہلے آل پاکستان کنونشن کے موقع پر اس تقریر کی اشاعت ماضی اور حال کے مابین ایک ربط قائم کرنے کی کوشش کا مظہر ہے۔

(ناظمِ اعلیٰ تنظیمِ اسلامی پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام کے بعد:

صاحب صدر! بزرگو اور دوستو..... میری آج کی گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ طلبہ کے اصل مسائل کیا ہیں اور انہیں کس طرح حل کیا جاسکتا ہے۔

طلبہ کے مسائل کا خطرناک تصوّر

..... اس سلسلے میں سب سے پہلے میں آپ حضرات کو یہ بتاؤں گا کہ طلبہ کے مسائل کا وہ تنگ نظرانہ تصور جو عام طور پر رائج ہے کس درجہ خطرناک اور ملک وملت کے حق میں کتنے برے نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ پھر میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہمارے اصل اور واقعی مسائل کیا ہیں اور ان کے حل کی صحیح راہ کون سی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ طلبہ کے مسائل کے بارے میں عام طور پر جو باتیں کہی اور سنی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ کالج کم ہیں، ہاسٹل نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ہیں ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ تعلیم بے حد مہنگی ہے اور جو چیز ایک آزاد ملک میں بے دام ملنی چاہئے اس کی ہمارے ملک میں بہت گراں قیمت وصول کی جارہی ہے۔ امتحانات کا نظم ٹھیک نہیں ہے۔ سپلیمنٹری امتحانات کو جن پر ایک طالب علم کے ایک سال کے ضیاع کا معاملہ منحصر ہوتا ہے بے حد کم ہیں اور جو ہیں ان سے استفادہ کی شرائط انتہائی کڑی ہیں۔

یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے مسائل ہیں جن پر "طلبہ کے مسائل" کا لیبل چسپاں کیا جارہا ہے اور ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل کرنے کو طلبہ کی سعی وجہد کا مقصود قرار دیا جاتا رہا ہے اس پر ستم یہ کہ اگر کوئی اس سے بڑھ کر ملک وملت کے مسائل کی طرف طلبہ کی توجہ کو منعطف کرانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لئے بلا تکلف طلبہ کے نصب العین کے دشمن کا خطاب استعمال کر دیا جاتا ہے۔

ہماری رائے میں طلبہ کے مسائل کا یہ محدود تصور انتہائی تنگ نظرانہ ہے اور ان مسائل کو طلبہ کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے جدوجہد کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ جب ہم اس رائے کا اظہار کرتے ہیں تو سب سے پہلی بات جو پیش نظر رہنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ ہم خود طلبہ ہیں اور جن مشکلات کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں دوسرے طلبہ کی طرح ہم خود بھی پوری طرح گرفتار ہیں۔ یہ بات اگر حکومت اور نظامِ تعلیم کے اربابِ بست و کشاد کی طرف سے کہی جائے تو کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ طالب علم اس پر کان نہ دھریں۔ لیکن جب ان کے کچھ طالب علم ساتھی ہی اس رائے کا اظہار کر رہے ہوں تو دوسرے طلبہ کو چاہئے کہ وہ ان کے لئے بلا تکلف حکومت کے ایجنٹ کا خطاب استعمال کرنے سے قبل ان کی باتوں کو سنیں اور ان پر غور کریں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ طلبہ کے مسائل کا یہ تصور تنگ نظرانہ ہے۔ تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ وہ مشکلات ہیں جن میں طلبہ گرفتار ہیں اور ملک و ملت کی فلاح و بہبود کا واقعی تقاضا یہ ہے کہ ان کو دور کیا جائے لیکن فی الواقع انہیں طلبہ کے مسائل کا عنوان دے کر اپنی نگاہوں کو انہی تک محدود کرنا انتہائی تنگ نظری ہے۔ ہم طالب علم ایک ملک میں بسنے والے مجموعہ افراد کا ایک حصہ اور ایک قوم کی متاعِ عزیز ہیں۔ ہمارے اصل مسائل وہی ہیں جن میں ہمارا ملک گرفتار ہے اور جو ہماری قوم کو گھیرے ہوئے ہیں ملک کے نصب العین سے مختلف ہمارا کوئی نصب العین اور قوم کے مسائل سے علیحدہ ہمارے کوئی مسائل نہیں ہیں، ہماری نگاہوں کو اس قدر تنگ نہیں ہونا چاہئے کہ ان میں بس اپنی چند مشکلات ہی بار پا سکیں بلکہ انہیں اس قدر وسیع ہونا چاہئے کہ وہ ملک و ملت کے تمام مسائل پر محیط ہوں اور اپنی مشکلات کو بھی انہی کے نقطہ نظر سے جانچیں اور پرکھیں۔

پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی مشکلات کے لئے سٹوڈنٹ کاز (STUDENTS CAUSE) کا نعرہ بلند کر کے کسی جدوجہد کا آغاز کرنا خطرناک ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ طریقِ کار نہ صرف یہ کہ ان مشکلات کے حل کرنے میں مدد اور معاون نہیں ہے بلکہ بہت سے ایسے ناخوشگوار اور تلخ احساسات کو جنم دیتا ہے جو ہمارے ملّی اور ملکی استحکام کی جڑوں کو اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح چٹ کر سکتے ہیں۔

اوّل تو جب آپ اسٹوڈنٹ کاز کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو گویا اعلان کرتے ہیں کہ طلبہ بقیہ قوم سے علیحدہ ایک طبقہ ہیں اور ان کا مفاد دوسرے طبقات سے متصادم ہے۔ طبقاتی کشمکش کا وہ احساس جو اس طرح پیدا ہوتا ہے ملّی و ملکی استحکام کی جڑوں پر ایک تیشہ بن کر گرتا ہے۔ یہی وہ طریق فکر ہے جو قوم میں ایک اور طرح کی تفریق سرمایہ و محنت کی شکل میں کرتا ہے اور وہاں طبقاتی تصادم پیدا کرتا ہے..... یہی طلبہ کو ایک اور حکومت اور نظام تعلیم کے ارباب بست و کشاد کو دوسرا طبقہ بنا کر انہیں لڑاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں یہ طبقاتی تصادم پیدا ہو جائے وہاں بدامنی، بے چینی، ہنگاموں اور جھگڑوں کو پیدا ہونے سے روکنے والی چیز کون سی ہو سکتی ہے اور پھر یہ بھی ظاہر بات ہے کہ ان چیزوں کو ایک محبِ وطن اور محبِ قوم کبھی برداشت نہیں کر سکتا سوائے ان چند لوگوں کے کہ جو اس بدامنی اور بے چینی سے فائدہ اٹھا کر کسی اور تحریک کے پنپنے کا سامان پیدا کرنا چاہتے ہوں۔

پھر اس طرح طلبہ اور حکومت اور نظام تعلیم کے اربابِ کار کو مقابل کی صفوں میں کھڑا کرنے کے بعد مشکلات کے امن پسندانہ حل کی توقع رکھنا بھی حماقت ہے۔ مشترک مفاد اور مشترک مقصد کو درمیان سے نکال کر آپ ان کو ایک دوسرے کا مدّمقابل بنا دیتے ہیں اور اس طرح گفت و شنید اور افہام و تفہیم کے تمام راستے بند کر دیتے ہیں۔ پھر ایک ہی راہ ہے کہ طلبہ اپنی قوت کے اظہار کے لئے ہڑتالیں کریں اور جلوس نکالیں اور حکومت اپنے وقار کے بت کی پوجا کرتے ہوئے گولیاں برسائے اور لاٹھیاں چلائے۔ ایک دوسرے کی مشکلات کو پیش نظر رکھ کر اور ایک دوسرے کی شکایات پر ہمدردانہ غور کرنے کے رویہ کو ترک کرنے کے بعد اور ایک ہی قوم کے حصے اور ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء ہونے اور ایک مشترک مفاد اور ایک مشترک مقصد رکھنے کے تصور کو خارج از بحث کرنے کے بعد یہی ایک شکل رہ جاتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جہاں بھی اس طریق کار پر عمل کیا گیا یہی نتائج نکلے اور اب جہاں بھی اس طریق کار کو اپنایا جائے گا ذہن چاہتا ہے اور عقل مطالبہ کرتی ہے کہ ٹھیک یہی، بلکہ اس سے کہیں خراب نتائج رونما ہوں۔

یہ وہ حقائق ہیں جو نہ صرف دلائل کی بنا پر صحیح ہیں بلکہ اپنی پشت پر تجربات کا وزن بھی لئے ہوئے ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ طلبہ کے مسائل کا یہ تصور تنگ نظرانہ اور اس کے

حصول کو نصب العین بنا کر ایک جدوجہد شروع کرنا خطرناک ہے۔

ہمارا حقیقی مسئلہ..... اب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہمارا اصل مسئلہ کون سا ہے۔ اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ میں ایک بات کہہ دوں میں چاہتا ہوں کہ آپ خود سوچ سمجھ کر ایک نتیجہ پر پہنچیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ذرا یہ سوچئے کہ کسی ملک اور کسی قوم کے نوجوان طلبہ اس ملک اور اس قوم کی اجتماعی زندگی مین کیا مقام رکھتے ہیں۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک اور قوم کا مستقبل ان نوجوان طلبہ ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اس کی اچھائی اور برائی کا تمام تر انحصار طلبہ ہی پر ہوتا ہے۔ انہی کے ہاتھوں میں قوم کے مستقبل کی باگیں ہوتی ہیں کہ جدہر چاہیں موڑ دیں اور وہی ملک کے مستقبل کے بارے میں اصل فیصلہ کن طاقت ہوتے ہیں۔ چاہیں تو اسے عزت و سربلندی کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیں اور چاہیں تو ذلت اور گمنامی کے گہرے غاروں میں جا گرائیں۔

چونکہ میری آئندہ گذارشات کا انحصار اسی ایک بات کے سمجھ لینے پر ہے اس لئے میں اس سلسلے میں ذرا تفصیل میں جانا پسند کروں گا۔

طلبہ ایک تمدن کے وارث ہیں..... آپ جانتے ہیں کہ ہر قوم اپنا ایک ماضی رکھتی ہے جو اسے جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے جس کے بقا پر اس کے قومی تشخص کے بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ وہ علوم میں اپنا ایک نقطۂ نظر، فنون میں اپنا ایک مزاج اور فلسفے اور عمرانیات میں اپنی ایک ڈگر رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں نہ صرف یہ کہ اسی ڈگر پر چلیں بلکہ اس میں مزید ترقی کریں..... ظاہر بات ہے کہ یہ تمام کام اُس قوم کے نوجوان طلبہ ہی کا ہوتا ہے کہ وہ اُس قوم سے جو تمدن جو تہذیب اور جو کلچر ورثہ میں پائیں اسے زندہ رکھیں اور آنے والی نسلوں کو منتقل کریں..... اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر قوم اپنی کچھ اجتماعی خواہشات اور مجموعی ارادے اور مقاصد رکھتی ہے اور یہ اس قوم کے نوجوان طلبہ ہی کا کام ہے کہ وہ ان اجتماعی خواہشات کو پورا کریں اور مجموعی ارادوں اور مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔

طلبہ ملکی استحکام کے محافظ..... اسی طرح کسی ملک کے استحکام اور بقاء کا انحصار بھی اس کے نوجوان طلبہ ہی پر ہوتا ہے۔ انہی کو آگے بڑھ کر ملک کی انتظامی مشینری کو چلانا ہوتا ہے۔ انہی کو ملک کی آزادی کا ضامن بننا ہوتا ہے۔ یہی ہوتے ہیں کہ جو ملک کے دفاعی حصار کے مورچوں کا چارج لیتے ہیں۔ انہی کے ہاتھوں سے ملک کی تقدیر لکھی اور مٹائی جاتی ہے۔ یہی چاہیں تو ملک کو اوج ثریا تک لے جائیں اور چاہیں تو تحت الثری میں پہنچا دیں۔

لہٰذا آپ میری بات سے پوری طرح متفق ہوں گے اگر میں کہوں کہ کسی قوم کے طلبہ کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح تیار کریں کہ وقت آنے پر قوم کے ماضی کے علمبردار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ اس کے تمدن اور اس کے کلچر کے نگہ بان ہوں اس کے علوم وفنون اور اس کے فلسفے اور آرٹ کو دنیا میں پھیلا سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مجموعی خواہشات اور اس کے اجتماعی ارادوں اور مقاصد کی تکمیل کر سکیں..... اور کسی ملک کے طلبہ کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس طرز پر تیار ہوں اور اس طرح ٹریننگ حاصل کریں کہ جب وہ اس ملک کا کاروبار سنبھالیں تو ایک طرف اس کی آزادی کے ضامن بن سکیں اور اس کے دفاع و استحکام کی ذمہ داری لے سکیں اور دوسری طرف اس کی انتظامی مشینری کو باحسن طریق چلا سکیں اور دنیا میں اس کی نیک نامی کا باعث ہوں۔

یہ کسی ملک اور کسی قوم کے نوجوان طلبہ کا "اصل مسئلہ" ہوتا ہے کہ جس پر ان کی نگاہوں کو مرتکز اور ان کی تمام کوششوں اور قوتوں کو مرکوز ہونا چاہئے۔

غور وفکر کا مقام..... اب میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر آپ اپنے بارے میں سوچیں کہ آپ کا اصل مسئلہ کون سا ہے!

○ ..... قومیت کے اعتبار سے آپ امّت مسلمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

☆ ..... اس امّت کے بارے میں کوئی غبی ہی ہو گا جو یہ نہ جانتا ہو کہ اس کی بنیاد نہ وطن پر ہے نہ رنگ پر، نہ نسل پر ہے نہ زبان پر بلکہ دین پر ہے۔ جس سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے جو ایک خاص نظریئے (IDEOLOGY) پر مبنی ہے۔

☆..... پھر یہ بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قوم کا ایک مخصوص نظریۂ کائنات و انسان ہے جو دنیا کے دوسرے تمام نظریات سے مختلف ہے علوم میں اس کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے جو دوسرے تمام نقطہ ہائے نظر سے علیحدہ ہے۔ فنون میں اس کا اپنا ایک مزاج اور فلسفے اور عمرانیات میں اس کی اپنی ایک ڈگر ہے۔ اس کا اپنا ایک تمدن ہے۔ یہ اپنا ایک مخصوص کلچر رکھتی ہے اور ان تمام چیزوں میں ایک غایت درجے کی انفرادیت کی حامل ہے۔

☆..... پھر اس کے مجموعی ارادوں اور اجتماعی مقاصد کے بارے میں بھی کون نہیں جانتا کہ یہ قوم بس ایک قوم کی طرح ان تمام چیزوں کو اپنی ذاتی ملک سمجھ کر خاموش بیٹھنے والی نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتی ہے کہ یہ اللہ کا دین ہے جس کی میں علمبردار ہوں۔ جس کو دنیا میں پھیلانا میرا مقصدِ وجود اور جسے دنیا میں قائم کرنا میری زندگی اور ایمان کا عین تقاضا ہے۔

ان حالات میں سوچئے کہ آپ کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کیا آپ مجھے ذرہ برابر بھی غلط بیانی کا الزام دیں گے۔ اگر میں کہوں کہ ہمارا اصل مسئلہ دنیا میں اسلامی فکر کے داعی نظریہ اسلامی کے علمبردار اور اللہ کے دین کے فوج دار بن کر کھڑا ہونا اور عالمگیر اسلامی انقلاب کی تکمیل میں اپنی قوتوں کو صرف کرنا ہے۔ جس ملّت سے آپ اپنا تعلق جوڑتے ہیں اور جس قوم سے آپ اپنا رشتہ باندھتے ہیں اس کا آپ سے یہی مطالبہ ہے اور اگر آپ نے یہی کام نہ کیا تو آپ اپنی قوم سے ایک بہت بڑی غداری کے مرتکب ہوں گے۔

○ ..... پھر ملکی نقطۂ نگاہ سے بھی سوچ لیجئے۔

☆..... آپ کا ملک اسلام کے لئے عالم وجود میں آیا ہے۔ اسلام ہی تھا کہ جس کے لئے آپ نے برعظیم ہند کی تقسیم کو گوارا کیا۔ اسی کی خاطر آپ نے چار کروڑ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنا منظور کیا اسی کی خاطر آپ نے قربانیاں دیں اسی کے لئے آپ نے گھر بار چھوڑا، عصمتیں لٹوائیں اور خاک و خون میں لوٹنا پسند کیا۔

☆..... پھر اسلام ہی آپ کے لئے ایک واحد چارۂ کار ہے اس کے بغیر آپ کے اتحاد کی کوئی شکل نہیں پاکستان میں کوئی ایک قومیت نہیں بستی یہاں ہزاروں نسلی و لسانی قومیتیں آباد ہیں۔ اسلام کے رشتے کو بیچ میں سے نکال دیجئے تو پھر کوئی اور چیز آپ کو جوڑ کر رکھنے والی نہیں ہے۔ آپ کے ہاں وحدتِ فکر اتحادِ عمل اور اشتراکِ مقصد کی کوئی اور راہ موجود نہیں

ہے۔ جاننے والے پہلے بھی جانتے تھے اور اب تو حالات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ اسلام کے سوائے آپ کے اتحاد کی اور کوئی سبیل موجود نہیں ہے۔ اسلام ہی ہے کہ جو آپ کے مختلف حصوں کو متحد اور مجتمع رکھنے کی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے۔ جو آپ کو متحد کر کے ایک قوت بنا سکتا ہے جو آپ کو وحدتِ فکر اور اتحادِ عمل کی نعمتوں سے مالامال کر سکتا ہے۔

پھر دنیا میں ہماری سربلندی اور عزت بھی اسلام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اوّل تو اسلام کے بغیر آپ کا ایک قوم بننا ممکن ہی نہیں ہے تاہم بفرض محال آپ کسی اور طریقے سے ایک منظم اور متحد قوم بن بھی جائیں تو دنیا میں پاکستان کی پوزیشن ایک ایسی چھوٹی سی قومی ریاست سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنے وجود کے لئے بڑی طاقتوں کی نگاہ کرم پر انحصار رکھتی ہو اب دنیا میں ان چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں کا دور گذر چکا ہے' یہ نظریہ ہائے حیات کا دور ہے یہاں وہی زندہ رہے گا اور پھلے پھولے گا جس کے پاس کوئی نظریہ..... ہو اور وہ اس کا داعی بن کر کھڑا ہو سکے اور کہہ سکے کہ یہ ہے وہ چیز جو دنیا اور نوع انسان کے دکھوں کا مداوا بن سکتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے آپ کو محسوس کرنا چاہئے کہ آپ وہ خوش قسمت مجموعۂ افراد ہیں جن کے پاس اللہ کا دین من و عن موجود ہے۔ جن کا مقصد وجود ہی یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اس دین کے داعی اور علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور جو اگر اپنے اس فرض کو ادا کریں تو نہ صرف یہ کہ دنیا میں سربلندی اور سرفرازی ان کے قدم چومے گی بلکہ آخرت میں اللہ کا انعام واکرام ان کا استقبال کرے گا۔

چنانچہ ملکی نقطہ نگاہ سے بھی سوچئے تو آپ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ کا اصل مسئلہ اقامت دین ہے۔ یعنی یہ کہ آپ پہلے پاکستان کو ایک مثالی اسلامی ریاست بنائیں اور پھر دنیا کے سامنے اللہ کے دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور نوع انسانی کو اس کی دعوت دے سکیں۔

ہماری نگاہ میں طلبہ کا وہ اصل مسئلہ جس پر ہماری تمام توجہات کو مرتکز اور تمام قوتوں کو مرکوز ہونا چاہئے اور جس کا مطالبہ ہم سے ہماری قوم بھی کرتی ہے اور ہمارا ملک بھی اور جس پر ہماری دنیا کی بہتری کا بھی انحصار ہے اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی کا بھی وہ یہ ہے

کہ۔

"ہم اللہ کے دین کو دنیا میں عملاً قائم کریں"

کہنے کو یہ بات میں پہلے ہی دو الفاظ میں کہہ سکتا تھا لیکن اس سے میرا مطلب اچھی طرح واضح نہ ہوتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا اصل مسئلہ اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم یہ بات مذہبی جنون اور ملّاپن کی دیوانگی میں کہہ رہے ہیں حالانکہ ہم اچھی طرح دلائل سے جانتے ہیں کہ یہی ہماری قوم کا مجموعی ارادہ ہے۔ اسی میں ہمارے ملک کی فلاح ہے اور یہی چیز ہماری عزت و نیک نامی کی ضامن اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

جو کچھ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ہماری نگاہ میں ہمارا اصل مسئلہ اللہ کے دین کا قیام ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ مسئلہ ملک کے عوام اور اربابِ حکومت کا بھی ہے اور طلبہ کا بھی' اگرچہ حکومت' عوام اور طلبہ تینوں ہی اس کام میں برابر کے حصہ دار ہیں لیکن طلبہ اس معاملہ میں کچھ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ موجودہ نسل اپنی پوری نیک نیتی کے باوجود ان صلاحیتوں اور قوتوں سے عاری ہے جو اس کام کے لئے درکار ہیں۔ موجودہ نسل دورِ غلامی کی پیداوار ہے اور اپنے ذہنی و فکری ڈھانچے اور سیرت و کردار کے سانچے میں وہ تمام خرابیاں بدرجہ اتم لئے ہوئے ہے جو غلامی سے پیدا ہوتی ہیں..... قوم کی تعمیرِ نو..... اور دین کی اقامت کا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دورِ آزادی میں تربیت پا رہے ہیں۔ ان ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نئے نظامِ زندگی کی تعمیر صحیح بنیادوں اور صحیح طریقوں پر کر سکیں گے۔ لہٰذا اگرچہ یہ مسئلہ حکومت کا بھی ہے اور عوام کا بھی۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ اہم پارٹ اس کام میں آج کے طلبہ کو ادا کرنا ہے۔

موجودہ ماحول کا جائزہ..... اب آپ ان حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جن سے آج پاکستان میں ہم دوچار ہیں اور جن سے عہدہ برآ ہو کر ہمیں اسلامی انقلاب کی راہیں ہموار کرنا ہیں۔

میں اس جائزے کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

☆..... ایک ہمارے عام معاشرے اور ریاست اور اس کے کاروبار کو چلانے والی حکومت کا جائزہ

☆..... دوسرے اس نظام تعلیم کا جائزہ جو اس وقت ہماری تعلیم گاہوں میں رائج ہے اور جن میں ان کَل پرزوں کو ڈھلنا ہے جو مستقبل کی مشینری کے لئے ہمیں درکار ہیں اور

☆..... تیسرے اس نسل کا جائزہ جو آج کالجوں اور اسکولوں میں زیر تربیت ہے اور جسے مستقبل میں ملک وملّت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے اس جائزے کے سلسلے میں جو مسائل مجھے آپ حضرات کے سامنے رکھنے ہیں ان کے ساتھ ہی میں ان کا وہ حل بھی عرض کر دوں گا جو ہمارے پیش نظر ہے۔

عوام اور حکومت..... معاشرے، ریاست اور حکومت کے جائزے میں تین باتیں بالکل روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہیں۔

اوّل وہ دینی اور اخلاقی انحطاط کہ جو اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دینی معیار اس حد تک گر گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب بھیجنے سے قبل بندوں کو کس قدر ڈھیل دیتا ہے اور عام اخلاقی معیار اس درجہ کم ہو گیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس اخلاق کے ساتھ ایک ہیئت اجتماعی کو کس طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف وہ سیاسی اور انتظامی بگاڑ ہے جو ہماری ملّی اور ملکی زندگی کو گھن کی طرح کھا رہا ہے لیکن میں ان کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ ان کی اصلاح کا کام براہ راست طلبہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ خود عوام سے متعلق ہے یا حکومت سے۔ ہمارے پاس تو اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ آئندہ آنے والی نسلوں کی اخلاقی تربیت کی کوشش کی جائے اور اسے میں پھر بیان کروں گا۔

تیسری چیز انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی معاشی بدحالی ہے' اور یہ چیز چونکہ ہم طلبہ پر بھی براہ راست اثرانداز ہوتی ہے۔ اس لئے اس معاملے میں' میں ذرا تفصیل میں جانا پسند کرونگا۔ یہی وہ ام الخبائث ہے جس کے پیٹ سے طلبہ کے وہ مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر میں نے اپنی گفتگو کے شروع میں کیا تھا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ معاشی بدحالی اپنی گہری جڑیں رکھتی ہے اور اس کے اسباب بہت دور رس ہیں اور یہ کہ اس کا علاج فوری طور پر ممکن نہیں..... اور یہ صرف طلبہ ہی پر نہیں ملک کے ایک ایک فرد پر مسلط ہے لیکن ہم اس کے

ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس ملک کے سیاسی رہنما اس صورت حال کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنی گدیوں کی حفاظت میں مگن ہیں اور انہیں اپنے سیاسی جوڑ توڑ سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اس ملک کے عوام کی معاشی بدحالی کو دور کرنے کی فکر کر سکیں۔

اس سال اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کے آرگن اسٹوڈنٹس وائس (STUDENTS VOICE) نے اپنے طور پر جو استصواب طلبہ کی معاشی حالت کے سلسلے میں کیا ہے اس کے نتائج اتنے زیادہ قابل اعتماد نہ بھی سہی جتنے حکومت کے کسی استصواب کے ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان سے پتہ چلتا ہے کہ طلبہ کس قدر شدید قسم کے معاشی بحران میں مبتلا ہیں اور کس کس طور پر تعلیم کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔

اس استصواب کے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۵ فیصد طلبہ = /۲۰۰ روپے سالانہ کے قریب فیس ادا کرتے ہیں۔ بیاسی فیصد طلبہ = /۲۰۰ اور = /۴۰۰ ادا کرتے ہیں اور صرف تین فیصد طالب علم ہیں جنہیں سکالرشپ ملتا ہے۔

تعلیم کے کل سالانہ خرچ کے سلسلے میں استصواب بتاتا ہے کہ ۲۵ فیصد طلبہ کو تقریباً = /۲۵۰ روپے سالانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں ۵۹ فیصد طلبہ تقریباً = /۵۰۰ روپے سال میں خرچ کرتے ہیں اور ۱۶ فیصد کو اس سے بھی زائد رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔

پھر اسی سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ۳۰ فیصد طلبہ کو تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ ان میں سے ۷۰ فیصد ہمہ وقتی ملازم بن کر بھی بہت کم کما پاتے ہیں اور ۶۰ فیصد کو اپنے گھر کے اخراجات بھی خود برداشت کرتے ہوتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طلبہ کو تعلیم کی کس قدر گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور وہ کن حالات میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

گرانیٔ تعلیم کا علاج..... اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتحال کا علاج کیا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں ہمارا یہ مطالبہ کرنا غلط ہے کہ حکومت فوراً ہمارے تمام مسائل کو حل کر دے اور چشم زدن میں ہماری تمام مالی مشکلات کو آسان بنا دے وہاں ارباب کار کا ہم سے یہ توقع رکھنا بھی غلط ہے کہ ہم بس چپ چاپ انہیں کرسیوں اور گدیوں کی جنگ میں

مصروف دیکھتے رہیں اور ان سے اس بات کا مطالبہ نہ کریں کہ وہ اپنی امکانی حد تک صورت حال کی اصلاح کی فکر کریں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا اپنے مسائل کو مطالبات بنا کر اٹھانا اور پھر جلوس نکالنا اور ہڑتالیں کرنا قوم اور ملک دونوں کے حق میں مضر ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت بھی اس بات کو محسوس کرے کہ اگر اس نے صورت حال کی اصلاح کی پوری کوشش نہ کی اور ان مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ نہ کی جو اس ملک کے طلبہ کو درپیش ہیں تو پھر یہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی مشکلات ایک ایسے آتش فشاں کی شکل اختیار کر سکتی ہیں جسے پھٹنے سے روکنا کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔ اس سال کراچی کے واقعات سے جو تجربہ ہماری حکومت کو ہو چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد بھی مزید تجربات کی کوشش کرنا اگر حماقت نہیں تو کم فہمی ضرور ہے۔

ان مسائل کے حل کی جو صورتیں ہم نے مفید پائی ہیں وہ دو ہیں :۔

(۱) ۔ ایک یہ کہ ان کو پورے ٹھنڈے دل سے سمجھنے اور سمجھانے کے موڈ میں ذمہ دار لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ طلبہ کی مشکلات کو خود اپنی مشکلات سمجھتے ہوئے ان پر ہمدردانہ غور کریں اور جس حد تک ان کے امکان میں ہو انہیں دور کریں اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ طالب علم چوکنے ہوں اور اپنی باگ ڈور ایسے سنجیدہ لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو معاملات کو پیچیدہ بنا کر اپنی لیڈری کا ڈھونگ نہ رچانا چاہتے ہوں بلکہ واقعی مسائل کا حل چاہتے ہوں اور نظام تعلیم کے کارپرداز اور حکومت کے اربابِ کار پوری سنجیدگی سے معاملات پر غور کریں اور جو کچھ وہ کر سکتے ہوں اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

(۲) ..... دوسرے یہ کہ طالب علم "اپنی مدد آپ" کے اصول پر عمل پیرا ہوں اور اپنی جن مشکلات کا حل خود کر سکتے ہوں ضرور کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جتنی قوت طلبہ اپنے مسائل کو حکومت کے سامنے رکھنے اور اس کیلئے آواز اٹھانے میں صرف کرتے ہیں اگر اتنی ہی قوت وہ اپنے مسائل کو خود حل کرنے میں صرف کریں تاکہ مسائل کا معتدبہ حصہ آپ سے آپ حل ہو جائے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے جو کہ آپ واقعی ان مسائل کا حل ہی چاہتے ہوں اور انہیں اٹھانے میں کوئی اور غرض آپ کے پیش نظر نہ ہو۔

نظامِ تعلیم کی خرابیاں..... عام معاشرے اور ریاست کے اس جائزے کے بعد اب ذرا اس نظام تعلیم پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جس کے تحت ہم تربیت پا رہے ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم میں دو طرح کی خرابیاں ہیں :۔

(ا) ۔ ایک فروعی قسم کی جنہیں طریق تعلیم کی خرابیاں کہا جاسکتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا بہت پرانا طریقہ رائج ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ ترقی ہو چکی ہے اس کا ہمیں بس اتنا علم ہے کہ دنیا کے کچھ حصوں میں ترقی یافتہ طریقوں سے تعلیم دی جارہی ہے یہاں ابھی تک وہ طریقے استعمال نہیں کئے جارہے۔ اسی سلسلے میں کچھ اور شکایتیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ امتحان کا طریقہ غلط ہے۔ اساتذہ کی تنخواہیں کم ہیں' لائبریریاں کم ہیں' کھیلوں کا انتظام اچھا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ

(ب) ۔ لیکن ہم جن خرابیوں کو اصل میں خطرناک اور مہلک سمجھتے ہیں وہ دوسری قسم کی ہیں اور انہی کو حقیقت میں نظام تعلیم کی خرابیاں کہا جاسکتا ہے اور وہ اس نظام تعلیم کی بنیادوں سے متعلق ہیں۔

(ا) ۔ ہمارے نزدیک اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اب تو یہ بالکل بے مقصد ہے لیکن اس کے مرتب کرنے والوں نے ٹھیک اپنے مقاصد اور اپنی اغراض کے پیش نظر اس کا مقصد "غلام سازی" رکھا تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے اقتدار کی گاڑی کھینچوانے کے لئے دیسی قلی مطلوب تھے اور ان دیسی قلیوں ہی کی تربیت کے لئے انہوں نے یہ نظام تعلیم مرتب کیا تھا جو ہمیں دور غلامی کی ایک وراثت کے طور پر ملا ہے۔

(۲) ۔ بے مقصدیت کے علاوہ اس نظام تعلیم کی دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں مغرب کے مرتب شدہ علوم جوں کے توں پڑھائے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغرب میں علوم کا ارتقاء اور ان کی ترتیب ایک خاص نقطۂ نظر سے ہوئی ہے اور یہ نقطہ نظر سراسر ملحدانہ ہے۔ یہ الحاد ان علوم میں اسطرح پیوست ہے کہ اس کو ان علوم سے علیحدہ کر کے نہ پڑھا جاسکتا ہے اور نہ پڑھایا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسطرح کے علوم نہ صرف یہ کہ ہمارے کام کے نہیں بلکہ ہمارے نقطہ نظر سے خطرناک ہیں۔

(۳) ۔ اس نظام تعلیم کی تیسری خرابی یہ ہے کہ اس میں ایک طالب علم کو صرف مجموعۂ علوم

بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کی سیرت و کردار کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

نئے نظام تعلیم کی ضرورت..... یہ نظام تعلیم جو تذکرہ بالا تین بنیادوں پر قائم ہے اور جس میں ان اصولی خرابیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے فروعی نقائص بھی موجود ہیں ہر گز اس لائق نہیں ہے کہ ہم زیادہ دیر تک اسے اپنے ملک میں برداشت کر سکیں۔ یہ نہ آزادی کی ضروریات پوری کرتا ہے اور نہ ہماری قومی خواہشات کی تکمیل میں ممد ہے۔ اب جو کام ہمارے پیشِ نظر ہے یعنی پاکستان میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور پھر دنیا بھر میں اسلامی انقلاب کی علم برداری اس کا تقاضا ہے کہ اس نظام کو جلد از جلد ہماری تعلیم گاہوں سے رخصت کیا جائے اور اس کی جگہ ایک نئے نظامِ تعلیم کو رائج کیا جائے جو ہماری ضروریات کو پورا کر سکتا ہو۔

ہمارے اس نئے نظامِ تعلیم کا واضح اور مثبت مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہو جو خود مسلمان بن کر اٹھیں اور دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کر سکیں۔ یہ نظامِ تعلیم ہماری نسل کو مسلمان بنا کر اٹھائے اور ان میں اُن صلاحیتوں اور قوتوں کی نشوونما کا انتظام کرے جو دنیا میں اسلامی انقلاب لانے کے لئے ناگزیر ہیں۔

اس مقصد کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نظام تعلیم کے لئے علوم و فنون کو خالص خدا پرستانہ نقطہ نظر سے مرتب کیا جائے۔ میں یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا صرف اختصار سے عرض کروں گا کہ اس سے ہماری مراد صرف یہ نہیں ہے کہ اسلامیات کے مضمون کو لازمی قرار دیا جائے بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ تمام علوم کو از سرِ نو اسلامی نقطہ نگاہ سے مرتب کیا جائے اور مغرب کے فلسفے اور عمرانیات کو یہاں صرف تنقیدی نقطۂ نگاہ سے پڑھایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلام انسانی زندگی کے لئے جو ہدایات دیتا ہے وہ یہ ہیں اور اسے چھوڑ کر انسانوں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں وہ ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ نظامِ تعلیم طلبہ کی سیرت و کردار کی تعمیر کی ذمہ داری بھی لے..... اسلام کے مفیدِ مطلب لوگ وہی ہو سکتے ہیں اور دنیا میں اسلامی انقلاب کا کام انہی لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا سکتا ہے جو سیرت و کردار کے اعلیٰ ترین مقامات پر سرفراز ہوں اور ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہمارے نظام تعلیم کا فرض ہونا چاہئے۔

یہ وہ بنیادی تبدیلیاں ہیں جو اس نظام تعلیم میں ہم چاہتے ہیں لیکن حاشا و کلا ہمارا ارادہ یہ نہیں ہے کہ اس معاملے کو ایک سیاسی نعرہ بنائیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ نظام تعلیم میں اتنا بڑا اور ایسا بنیادی انقلاب فوری طور پر نہیں لایا جاسکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو ابھی نہ خود طلبہ میں، نہ عوام میں اور نہ ارباب حکومت میں..... یہ احساس اور شعور پوری طرح پیدا ہو سکا ہے کہ نظام تعلیم میں اسطرح کی تبدیلی کی ضرورت ہے اور دوسرے یہ کام واقعی بڑا کٹھن ہے اور بڑی محنت چاہتا ہے اور اس بات کا طالب ہے کہ کچھ ہمت والے اہل علم اس کام کو اپنے ذمے لیں اور علوم کی از سرِ نو تدوین کا کام کریں تاہم اس معاملے میں جو کچھ کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہئے وہ یہ ہے کہ :-

(۱) ۔ ایک طرف طلبہ میں عموماً اور عوام میں خصوصاً یہ احساس بیدار کیا جائے کہ یہ نظامِ تعلیم انتہائی ناقص ہے، اور ان اجتماعی خواہشات اور ارادوں کے پورا کرنے کی کوئی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا جو ہمارے پیش نظر ہیں۔

(۲) ۔ دوسری طرف اہل علم حضرات کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ مطلوبہ نظام تعلیم کی بنیادوں کو واضح طور پر مرتب کریں اور وہ طریقہ بتائیں کہ جس سے موجودہ نظامِ تعلیم کو آہستہ آہستہ نئی ضروریات کے مطابق ایک بالکل نئے نظام تعلیم میں تبدیل کیا جاسکے۔ اور

(۳) ۔ تیسری طرف حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تدریجاً ایسے اقدامات کرے جن سے نظام تعلیم میں مطلوبہ تبدیلی لائی جاسکے۔

یہ تینوں کام اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جن طلبہ نے اس کام کی اہمیت کو محسوس کیا ہو وہ منظم ہو کر ایک تنظیم بنائیں اور یہ تینوں کام کرنے کی کوشش کریں۔

طلبہ کا جائزہ..... اس جائزے میں تیسرے نمبر پر خود طلبہ ہیں اور انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خرابیاں پورے طور پر خود ان میں بھی نفوذ کئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اقامتِ دین کے سلسلے میں اصل کام ہم طلبہ ہی کو کرنا ہو گا۔ اس لئے جو بیماریاں ہم اپنے اندر چھپائے پھر رہے ہیں، ان کی صحیح تشخیص اور ان کے علاج کی فکر بھی ضروری ہے لہٰذا اس معاملے میں کچھ طرف داری برتنا اور سارے کا سارا الزام حکومت

پر ڈال دینا صحیح نہیں ہے۔ ہمیں اپنی خرابیوں کا جائزہ کچھ زیادہ ہی باریک بینی سے لینا چاہئے چنانچہ میں اس معاملہ میں بھی ذرا تفصیل سے کام لوں گا۔

(۱) گرد و پیش سے بے خبری..... سب سے پہلی بات جو مجھے کھٹکتی اور آپ کو بھی کھٹکتی ہوگی وہ بے حسی اور لاپرواہی ہے جو زندگی کا معمول بن گئی ہے۔ بہت کم طلبہ ایسے ہیں جنہوں نے زندگی کے بنیادی مسائل پر کبھی سوچا ہے اور ان میں ان لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کی مقدار جتنی ہے جنہوں نے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا کوئی مقصد اور مصرف بھی تجویز کیا ہے۔

اکثر ایسے ہیں جنہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ اب ہم آزاد ہیں اور اس حیثیت سے ہماری حالت اس حالت سے مختلف ہے جو اس سے سات[1] سال قبل تھی۔ ہم میں سے ننانوے فیصد لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے بلکہ اس بات سے بھی کہ خود ان کے ملک میں کیا ہو رہا ہے..... اب آپ خود سوچئے کہ اس قدر بے حسی اور بے ہوشی کس بات کا اشارہ کرتی ہے یقیناً اس بات کا کہ مریض بس دم بھر کا مہمان ہے۔

(۲) دینی اور اخلاقی حالت..... دوسری بات جسے میں نہایت اہم سمجھتا ہوں یہ ہے کہ ہمارے طلبہ کا دینی معیار گرتے گرتے صفر تک پہنچ رہا ہے۔ دین کا علم یہاں نام کو بھی نہیں ملتا دین کی بنیادی باتوں تک سے وہ لوگ بے خبر ہیں جو عنقریب گریجوایٹ بننے والے ہیں رہے نماز، روزہ اور دوسرے دینی فرائض تو ان پر عمل پیرا ہونا تو کجا ان کے مذاق اڑانے تک کو اب فیشن کا مقام حاصل ہو چکا ہے

عام اخلاقی حالت بھی بے حد دگرگوں ہے..... اور اس کا اندازہ آپ سب حضرات کو اچھی طرح ہے میں نہیں چاہتا کہ زیادہ تفصیل سے اس معاملہ پر گفتگو کروں، ہمارا اخلاق جس درجہ گر گیا ہے اس کا ہمیں شب و روز مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اس سال کراچی کے طلبہ نے اور وہ بھی کالجوں کے نہیں بلکہ ہائی سکولوں کے طلبہ نے لاہور جاتے ہوئے جو ہلڑبازی کی تھی وہ ابھی ایک تازہ واقعہ ہی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اخلاق کو کس درجے گھُن لگ چکا ہے۔ اسی طرح یہیں یوم استقلال پر جو کچھ ہوا تھا اسے کون نہیں جانتا صرف ان دو باتوں سے بھی اچھی

---

[1] واضح رہے کہ یہ تقریر ۱۹۵۳ء میں کی گئی تھی

طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری اخلاقی حالت کس قدر زبوں ہو چکی ہے۔

(۳) تعلیمی معیار..... پھر تعلیمی معیار کے بارے میں آئے دن خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں کہ وہ دن بدن گر رہا ہے۔ امتحانوں میں کامیابی کا فیصد تناسب بہت گر چکا ہے پھر جو پاس ہوتے ہیں وہ بھی فی الواقع معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محنت کرنے کا مادّہ بالکل ختم ہو رہا ہے اور محنت سے جی چرانے کی عادت عام ہو رہی ہے۔

کم و بیش یہ ہے وہ حالت کہ جس میں خود ہم طلبہ گرفتار ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ وہ غلط نظام تعلیم ہے جس کے تحت ہم نے پرورش پائی ہے اور اس کا واحد علاج ایک صحیح اسلامی نظام تعلیم ہے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ابھی تو صحیح اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا کجا کہ اس کے نفاذ کی امیدیں وابستہ کی جائیں اور اسی امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہا جائے۔ یہ صورتحال ایک فوری علاج کا مطالبہ کرتی ہے اور جہاں تک عقل کام کرتی ہے ——————— اس کا علاج صرف یہ نظر آتا ہے کہ جب تک ایک مکمل اسلامی نظام تعلیم درس گاہوں میں جلوہ آرا نہیں ہوتا وہ طلبہ جنہیں اصلاح کی ضرورت کا احساس ہے اور جو کم از کم اپنے بارے میں طے کر چکے ہیں کہ انہیں اقامتِ دین ہی کا کام کرنا ہے۔ منظم ہوں اور اس عبوری دور میں امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ طلبہ کو موجودہ غلط نظام تعلیم کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور ان کے لئے اس علمی اور اخلاقی تربیت کا اہتمام کریں جو انہیں ایک اسلامی نظام تعلیم مہیا کرتا اور زیادہ سے زیادہ طلبہ تک اسلام کی دعوت پہنچائے اور ان میں اصلاح کی ضرورت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کریں پھر ان لوگوں کو جو اس جذبے سے معمور ہو جائیں ایک نظم میں منسلک کریں اور انکی اخلاقی اور علمی تربیت کی کوشش کریں..... حضرات..... میرے نزدیک یہ ہے "طلبہ کے مسائل" کا صحیح تصور اور یہ ہے انکے حل کا صحیح طریق۔

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم والسلام علیکم و رحمة اللّٰه

❀❀❀

نئی کارمینا

نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ پُرتاثیر

انسان کی تن دُرستی کا زیادہ تر انحصار معدے اور جگر کی صحت مند کارکردگی پر ہے۔ اگر نظامِ ہضم درست نہ ہو تو دردِ شکم، بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، گرانی یا بھوک کی کمی جیسی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں جس کے سبب غذا صحیح طور پر جزوِ بدن نہیں بنتی اور صحت رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگتی ہے۔

پاکستان اور دنیا کے بہت سے ممالک میں ہمدرد کی کارمینا پیٹ کی خرابیوں کے لیے ایک مؤثر نباتی دوا کے طور پر شہرت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ ہر گھر کی اہم ضرورت ہے اس لیے ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں اس کی افادیت پر بروقت تحقیقی و تجرباتی کام جاری رہتا ہے۔ نئی کارمینا اسی تحقیق کا حاصل ہے۔ نئی کارمینا کو پودینے کے جوہر اور دیگر مفید و مؤثر اجزا کے اضافے سے زیادہ قوی، پُرتاثیر اور خوش ذائقہ بنا دیا گیا ہے۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کو بیدار کرنے، معدے اور آنتوں کے افعال کو منظم و دُرست رکھنے میں زیادہ کارگر ہے۔

بچوں، بڑوں سب کے لیے مفید **نئی کارمینا** ہمیشہ گھر میں رکھیے

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

نعیم اختر عدنان

پاکستان کی موجودہ صورتِ حال میں اسلامی انقلاب کی ضرورت و اہمیّت

ایک ہمہ پہلو جائزہ

ہماری موجودہ حالت اور اس کا جائزہ

وطن عزیز مملکتِ خداداد پاکستان کا سماجی و معاشی اور سیاسی ڈھانچہ مکمل طور پر ظالمانہ و استحصالی اور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اس لئے اس ملک کے کروڑوں باشندے جنہیں ہم بے بس اکثریت بھی کہہ سکتے ہیں۔ مسائل کے انبار تلے چیخ و پکار کر رہے ہیں مگر کوئی بھی تو ان کی آواز نہیں سنتا۔ آخر سنے بھی کون اور کیونکر؟

بانیٔ پاکستان جناب قائداعظم کی رحلت کے بعد وہ مٹھی بھر سرمایہ دار اور جاگیردار اقتدار کے وارث بن گئے جنہوں نے آزادی کی جدوجہد میں تو کوئی حصہ نہیں لیا تھا البتہ قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ ان کا ہمیشہ سے مقصد اولین رہا ہے۔

آپ پاکستان کی پہلی اسمبلی اور اُس کے بعد آج تک قومی و صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ہونے والے ارکان کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہر دور میں جاگیردار طبقات ہی قوم کی گردن پر سوار نظر آئیں گے۔ مسلم لیگ، ری پبلکن پارٹی کنونشن لیگ، پیپلز پارٹی، غرض جس سیاسی قوت یا جماعت کے ہاتھ میں اقتدار آیا اس طبقے نے اس میں شامل ہونے اور اپنی سیاسی وفاداریاں بدلنے میں کبھی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور ہر حکومت نے ان کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ کروڑوں عوام یعنی بے بس اکثریت کے مفادات کو اس مٹھی بھر طبقہ کے مفادات کی چوکھٹ پر قربان کر دیا۔ حاصل کلام یہ کہ اس ملک کے اقتدار پر تقریباً نصف صدی سے ایک ایسا طبقہ قابض و متصرف ہے جو نہ صرف شریعت الٰہی کا باغی ہے بلکہ انسانی حقوق کو غصب اور پامال

کرنے والا بھی ہے۔ دوسری طرف عوام کی اکثریت کو ضروریات زندگی تک سے محروم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وسائل رزق کی اس غیر منصفانہ تقسیم نے بے بس اکثریت کو مسائل کے نہ ختم ہونے والے سلسلے میں گرفتار کر دیا ہے۔

وطن عزیز کے موجودہ حالات کی تصویر کشی کی جائے تو اس کے مختلف رنگ کچھ اس طرح سے سامنے آتے ہیں۔

سود خوری خدا و رسولؐ کے ساتھ جنگ

سود جیسی خبیث شے کو شیر مادر سمجھنے والوں اور اس پر مبنی نظام معیشت کے حامل معاشرے کو خدائے واحد نے اپنی آخری کتاب میں بہت سخت دھمکی دی ہے :۔ "اے وہ لوگو! جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو اگر تم واقعی ایماندار ہو تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور تمہارا سود جو (دوسروں کے ذمے) باقی ہے اس کو چھوڑ دو۔ پس اگر تم ایسا نہ کرو تو تمہارے خلاف اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ ہے" (البقرۃ = ۲۷۸، ۲۷۹)

مسلمانان پاکستان ذرا غور فرمائیں کہ جو قوم کسی سپر پاور سے جنگ لڑ رہی ہو وہ راحت و آرام کی زندگی کیسے بسر کر سکتی ہے مگر افسوس کہ آج ہمیں اس کی حقیقت کی سنگینی کا احساس تک نہیں کہ ہم اس کائنات کی واحد اور حقیقی سپر پاور سے برسرپیکار ہیں۔ مقام حسرت و افسوس ہے کہ لاالہ الا اللہ کے نام پر وجود میں آنے والی مملکت آج سودی نظام معیشت کی ظلمتوں میں گھر کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کا نتیجہ بھگت رہی ہے۔

۲۔ ملاوٹ و دھوکہ دہی

آج ملاوٹ اور دھوکہ دہی کو دولت سمیٹنے کا ایک بہترین ہنر سمجھ لیا گیا ہے۔ اشیائے خورد و نوش اور ادویات تک میں ملاوٹ آج ہماری قومی پہچان بن کر رہ گئی ہے اور ہم اپنے بھائیوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر کے اپنے لئے دنیا و آخرت کی رسوائی کا سامان جمع کر رہے ہیں۔ اس فرمان نبویؐ کی روشنی میں کہ "جس نے ملاوٹ کی اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں" اندازہ لگائیے کہ ہم اس انسانیت کش حرکت سے حضورؐ کی امت سے خارج ہونے کا خطرہ مول لے رہے ہیں۔

اے کاش ہمیں اپنے مقام کا احساس ہوتا۔ یہ وہ مقام بلند ہے جس کی آرزو حضرت موسیٰ جیسے صاحب کمال نبیؑ نے بھی کی تھی۔

۳۔ رشوت ستانی

اس میدان میں آج ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارا سربراہِ مملکت بھی یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا کہ رشوت کا ریٹ پانچ روپے سے بڑھ کر پچاس روپے ہو گیا ہے۔ اور تو اور وزرائے کرام سے لیکر ارکان اسمبلی تک اس مرض میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ جب قوم کے راہنما و محافظ ہی ڈاکوؤں اور لیٹروں کا منصب سنبھال لیں تو باقی معاشرے کا ذکر ہی کیا! حالانکہ جس نبیؐ کے ہم ماننے والے ہیں اس ذات گرامی کا ارشاد ہے۔ "رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں"۔ کبھی یہ خیر امت اپنے نبیؐ کے اس فرمان کی صداقت پر غور کر لیتی تو یہ حالت ہرگز نہ ہوتی جس سے آج ہر اہل وطن پریشان ہے۔

۴۔ وعدہ خلافی اور خیانت

انفرادی سطح سے لے کر ملی و قومی سطح تک ہم اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ اپنے ہم مذہب اور ہم وطن بھائیوں سے بھی وعدہ خلافی کی روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پچاس سال قبل خالق کائنات سے کیا گیا وعدہ "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" ہم پس پشت ڈال چکے ہیں اور یوں قیام پاکستان کے مقاصد سے انحراف ہمارے اس قول و فعل کے تضاد کی منہ بولتی تصویر ہے۔

رہ گئی امانت اور اس کا پاس تو یہ تو گویا ہمیں معلوم ہی نہیں کہ کس چڑیا کا نام ہے۔ بس ہم تو صرف یہ جانتے ہیں۔

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم

اپنی حیثیت اور منصب سے ناجائز مفادات حاصل کرنا اپنا حق سمجھا جاتا ہے۔ سرکاری خزانے کا مفہوم گھر کی مرغی ہے جسے جب چاہا ذبح کر کے کھالیا۔ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو تو کیونکر؟ اور یوں ہم اپنے کردار سے اپنے مسلمان ہونے کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کر رہے ہیں حالانکہ نبی رحمتؐ نے فرمایا "اس کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت کی پاسداری نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جس میں وعدہ کی پابندی نہیں"۔ مگر اس فرمان نبوی کے باوجود ہمارے ایمان و اسلام کی مضبوط عمارت میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیسے مطمئن اور نڈر ہیں ہم لوگ!

۵۔ لینے اور دینے کے مختلف پیمانے

ایک معاملہ تو ناپ اور تول میں کمی کا ہے جسے ہم سب جانتے اور پہچانتے ہیں اور اس کی ہمارے ہاں کمی نہیں۔ مگر اس سے اہم تر معاملہ حقوق و فرائض میں توازن کا ہے۔ یہاں معلوم ہو گا کہ اپنے خود ساختہ حقوق کی فہرست بہت طویل بلکہ لامحدود مگر کسی قسم کے فرائض اور ذمہ داریاں قبول کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں۔ جہاں تک دوسروں کے حقوق کا تعلق ہے ان کا ذکر بھی زبان پر نہ آئے گا۔ ان کیلئے فرائض اور ذمہ داریوں کی طویل فہرست تیار کر رکھی ہے۔ ایک جاگیردار سے کسان اور ہاری کی اجرت اور ایک کارخانہ دار سے محنت کش ملازم کی اجرت دریافت کیجئے۔ بات کچھ چھ سو اور سات سو کے درمیان چکر کھائے گی لیکن اگر آپ اسی شخص کو چار ہزار روپے میں مہینہ بھر کیلئے گزر اوقات کرنے کیلئے کہیں تو جواب "ناممکن" میں آئے گا۔ وجہ صرف ایک ہی ہے یعنی لینے اور دینے کے پیمانے مختلف ہو چکے ہیں۔

۶۔ ظلم و نا انصافی

ہمارے اس طرز عمل کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو فراموش کر دیا کہ "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کیلئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اسے اپنے لئے پسند ہے۔" مغرب سے درآمد شدہ موجودہ استحصالی نظام نے ظالم اور مظلوم دونوں کو اپنی اپنی حالت سے مطمئن رہنا سکھایا ہے اور یوں گویا ظلم و نا انصافی ہمارے دل کی آواز بن گئی ہے۔ ظالموں کا تو شیوہ ہی ظلم کرنا ہے مگر مظلوم بھی ظلم کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اور ظلم کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کرتا۔ حالانکہ خود دین اسلام عطا کرنے والے خالق نے نہ صرف ظلم کے خلاف احتجاج کی اجازت دی ہے بلکہ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن مجید کے چھٹے پارے کی پہلی آیت کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ بری بات کو اونچی آواز سے بیان کرنے کو ناپسند کرتا ہے مگر مظلوم اس پابندی سے آزاد ہے۔ یعنی ظالم اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا مظلوم کا حق ہے، مگر قرآن کی یہ انقلابی و آفاقی تعلیمات تو ہمارے دین دار طبقے نے عوام الناس سے چھپا رکھی ہیں اور انہیں تقدیر کا مقدس فریب دے کر بہلایا جا رہا ہے۔ درآنحالیکہ رہبر اعظم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ پوچھا گیا مظلوم کی مدد

کرنا تو معلوم و معروف ہے مگر ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے اس کے ظلم سے روک دیا جائے۔

۷۔ فحاشی و عریانی کا طوفان

واقعہ یہ ہے کہ آج ہم اس معاملے میں مغربی معاشرے کے دوش بدوش ہی نہیں اس سے دو ہاتھ آگے نظر آتے ہیں کیونکہ ہم اس شعبہ میں اب ترقی پذیر نہیں ترقی یافتہ ہیں۔ بے حیائی و فحاشی کے آلات شاید مغربی ممالک نے ہمارے ہی لئے بنائے ہیں۔ ٹیلی ویژن ہو یا وی سی آر' اخبارات ہوں یا رسائل و جرائد' فائیو سٹار ہوٹلوں کے سوئمنگ پول ہوں یا تفریحی پارک' کالج ہو یا دفتر' الامان والحفیظ۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہم انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانوں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔

۸۔ مسرفانہ طرزِ معاشرت

معاشرے کے مختلف طبقات کے مابین طبقاتی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک طرف کئی کئی ایکڑ پر مشتمل ایوان صدر' وزیر اعظم ہاؤس' گورنر ہاؤس اور دیگر سرکاری و نجی رہائشی بنگلہ جات' لمبی لمبی چمکدار کاریں اور عیاشی و فضول خرچی کے دوسرے لوازمات کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ دوسری طرف کروڑوں عوام بنیادی انسانی ضرورتوں سے بھی محروم ہیں۔ شہری علاقوں میں جائز ذرائع سے رہائشی پلاٹ خریدنا اور پھر اس پر عمارت بنانا ناممکن ہے' لہٰذا خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی تنخواہ کا آدھا حصہ کرایہ مکان کے طور پر عمر بھر ادا کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم و علاج کی سہولت کا ذکر ہی کیا' وہ تو گویا بس چند وڈیروں یا لیڈروں ہی کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی بے بس اکثریت یا معاشی غلاموں کو علم کے زیور سے آراستہ کر کے اور بیماریوں سے محفوظ تندرست جسم عطا کر کے یہ ظالمانہ طبقاتی نظام بھی تو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ لہٰذا یہ بالادست طبقات کی مجبوری ہے۔ پھر ان طبقات کی بلا سے کہ عوام کو ٹرانسپورٹ کی کوئی سہولت میسر ہے یا نہیں! دفتر' فیکٹری' سکول' کالج اور ہسپتال جانے کیلئے اربن ٹرانسپورٹ' ویگن سروس اور پرائیویٹ بسیں کس طرح انسانوں کو بھیڑ بکریوں بلکہ گڈز کمپنیوں کے ٹرکوں میں لادی جانے والی اشیاء کی طرح ٹھونستی ہیں اس سے انہیں کیا غرض۔ ان ذرائع سے سفر کرنے والے حضرات کے اوسطاً چار گھنٹے روانہ اس ٹرانسپورٹ کی نذر کرا دیئے جاتے ہیں تاکہ بارہ چودہ گھنٹے کی محنت و مشقت کے بعد یہ لوگ کسی اور طرف متوجہ ہی نہ ہو سکیں اور

صورت حال کچھ یوں ہو جائے۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

موجودہ صورتحال کے اسباب اور اس کے ذمہ دار طبقات

مملکت خداداد پاکستان میں نافذ سماجی، سیاسی اور معاشی نظام استحصالی اور آمرانہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر ناقص اور فرسودہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ جس انتظامی و معاشرتی نظام میں کسی شہری کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ نہ ہو، اور جس عدالتی نظام میں انصاف ملتا نہ ہو مگر خریدا جا سکتا ہو، جہاں عظیم اکثریت بنیادی انسانی ضروریات تک سے محروم ہو، سر چھپانے کیلئے جھونپڑا اور دو وقت کا کھانا تک میسر نہ ہو، ایسا نظام آخر کس کام کا! لہٰذا ہمارے خیال میں موجودہ مشکلات اور مسائل کا واحد ذمہ دار یہی فرسودہ نظام ہے اور ان مسائل کا واحد حل اس نظام کی بیخ کنی ہے!

اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہو گا کہ ظالمانہ اور فرسودہ ہونے کے باوجود یہ نظام رائج و نافذ کیوں ہے؟ ہر رائج الوقت نظام کے کچھ محافظ بھی ہوتے ہیں، جن کے مفادات اس نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کی ساری توانائیاں اس ظالمانہ نظام کے تحفظ اور اسے برقرار رکھنے کیلئے صرف ہوتی ہیں۔

انبیاء کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے۔ حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی کی تعلیم کے اولین مخالفین قوم کے سردار، چودھری اور وڈیرے ہی ہوتے تھے، جنہیں آپ بالادست طبقات بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی مختصر مگر با اختیار طبقہ جس کے ہاتھوں میں پورے ملک کی معاشی و سیاسی باگ ڈور ہوتی ہے اس ظالمانہ نظام کا پورا پورا دفاع کرتا ہے۔

پسماندہ اور دبے ہوئے طبقات کو معاشی و سماجی جبر سے نجات دلانا اسلام کی تعلیمات کے اہم ترین مقاصد اور اہداف میں ہمیشہ سے شامل رہا ہے۔ چنانچہ انہیں مراعات یافتہ بالادست طبقات کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کیلئے اس طبقاتی اونچ نیچ کے بت کو پاش پاش کرنا ہو گا۔ اس کے بغیر اجتماعی نظام کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

بے جان مذہبیت اور فرقہ واریت کا علمبردار طبقہ

اس طبقے کی عظیم اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دین و مذہب سے عملی دلچسپی رکھتی ہے۔ چنانچہ انہی کے دم قدم سے مساجد تعمیر ہوتی ہیں اور آباد رہتی ہیں۔ مدارس و مکاتب اور دارالعلوم قائم ہوتے ہیں اور ان میں قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جمعہ و جماعت کا نظام قائم ہے۔ ماہ صیام کے دوران تراویح اور شبینوں میں قرآن کی تلاوت کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ حج و عمرہ کیلئے آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے۔ الغرض عبادات و رسومات کی حد تک پورا مذہبی ڈھانچہ قائم ہے۔ لیکن ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس طبقے کی اکثریت کا تصور دین نہ صرف یہ کہ نہایت محدود ہے بلکہ اکثر و بیشتر حالتوں میں مسخ شدہ بھی ہے چنانچہ ان کے ہاں دین صرف بعض علامات اور رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور اُس کا کوئی تعلق نہ انسان کی انفرادی سیرت و کردار سے ہے نہ قومی و ملی امور اور اجتماعی معاملات سے۔ نتیجۃً وہ دین جو اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے پوری انسانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیکر اُس پر حکمرانی چاہتا ہے اُن کے یہاں زندگی کے بہت ہی چھوٹے سے دائرے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے وسیع تر تقاضوں کا انہیں سرے سے کوئی شعور ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس حلقے کی ایک غالب اکثریت کا حال یہ ہے کہ دینداری کے جملہ مظاہر یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور حج حتیٰ کہ پوری شرعی وضع قطع کے ساتھ ساتھ بلیک مارکیٹنگ بھی چلتی ہے اور ذخیرہ اندوزی بھی، اسمگلنگ بھی جاری رہتی ہے اور کرنسی کا غیر قانونی لین دین بھی، اشیائے خورد و نوش اور ادویات تک میں ملاوٹ جیسی حد درجہ مکروہ حرکت انہیں برائی معلوم نہیں ہوتی۔ انکم ٹیکس، کسٹم، ایکسائز ڈیوٹی اور دیگر سرکاری محصولات کی چوری کو مباح قرار دینے میں انہیں کوئی عار نہیں۔ رشوت دی بھی جاتی ہے اور لی بھی جاتی ہے۔ سودی رقوم سے کاروبار کو وسیع تر کرنا اور بنگلہ جات تعمیر کرنا تو شیر مادر ہے ہی، جہاں موقع ملے جوئے اور سٹے سے بھی اجتناب نہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ اس حلقے کی اکثریت الا ماشاء اللہ ذاتی اخلاق اور بین الانسانی معاملات میں بالعموم بہت گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ خشونت، درشتی اور سنگ دلی بالعموم ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور دل کی نرمی سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں (الا ماشاء اللہ)

ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل ان لوگوں سے بیزار و متنفر ہو کر

سرے سے دین و مذہب ہی سے بدظن ہوتی چلی جارہی ہے۔ تصور مذہب کی اسی محدودیت کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مذہب کے نام پر نت نئی رسومات ایجاد ہو رہی ہیں اور بدعات کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا جارہا ہے اور اسلام جو انتہائی سادہ ' دین فطرت ہے ' روز بروز اوہام کے پلندے اور بدعات و رسومات کے طومار کی شکل اختیار کرتا چلا جارہا ہے ' اس کی بنیادی وجہ بالکل واضح ہے کہ دین جسے انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں سرایت کر جانا چاہئے تھا جب سمٹ سمٹا کر ایک گوشے میں مقید ہو گیا تو اس نے زور لگا کر اسی ایک گوشہ میں غیر متناسب طور پر بڑھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک طرف میت کی رسومات کا سلسلہ ہے کہ ربڑ کی طرح کھنچتا چلا جارہا ہے اور دوسری طرف تہواروں اور جلوسوں کا معاملہ ہے کہ ان کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جارہی ہے اسی پر دوسرے معاملات کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مساجد جو رشد و ہدایت کے سرچشمے تھے فرقہ پرستی کے گڑھ بن گئے اور یوں من دیگرم تو دیگری والا معاملہ نظر آتا ہے۔

مختصر یہ کہ دین مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی اکثریت کا تصور مذہب نہایت محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی۔ اس لئے یہ طبقہ بھی دانستہ اور نادانستہ طور پر موجودہ ظالمانہ نظام کی گرفت کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

اب ہمیں اس ظالمانہ نظام کو تبدیل کرنے کے طریق کار پر غور کرنا ہے۔ کسی بھی نظام کو بدلنے کے دو طریقے مروج ہیں..... انتخابی طریق کار اور انقلابی طریق کار۔ سب سے پہلے ان دونوں طریق ہائے کار کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔

انتخابی و انقلابی جدّوجہد کا فرق

ہمارے نزدیک کسی بھی جماعت کیلئے سب سے پہلے فیصلہ طلب بات یہ ہوتی ہے کہ وہ جس ملک میں کام کر رہی ہے یا کرنا چاہتی ہے ' آیا اس کے نزدیک اس ملک کا رائج الوقت نظام (سماجی ' سیاسی و معاشی ڈھانچہ) بنیادی طور صحیح ہے یا کلی طور پر غلط ہے۔ اگر کسی جماعت کی رائے یہ ہو کہ موجودہ نظام تو صحیح ہے مگر اس کو چلانے والے ہاتھ غلط ہیں ' گویا جزوی خرابی یا خرابیاں ہیں تو وہ میدان سیاست کے راستے انتخابات میں قسمت آزمائی کر کے ہاتھوں کو بدلنے کی کوشش کرے گی۔ اور اگر رائے یہ ہو کہ موجودہ نظام ہی غلط ہے تو جدوجہد انقلابی خطوط پر ہوگی اور انتخابات کا راستہ اختیار کرنا اپنی منزل کھوٹی کرنے کے مترادف ہو گا۔

اب ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ اس مرحلے پر موجودہ حالات میں "اقدام" کی کیا صورت ممکن ہے!

وطن عزیز پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اور ارباب اقتدار بھی مسلمان ہیں، لہٰذا "اقدام" کے لئے حکمت عملی غور و خوض کی متقاضی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کا مسلم حکومت کے خلاف تلوار اٹھانا جائز ہے، لیکن اس کے لئے فقہاء نے بڑی سخت اور کڑی شرائط عائد کی ہیں۔ ویسے بھی اب تمدن میں بڑی پیچیدہ تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ مزید یہ کہ ایک جانب عوام الناس بالکل نہتے ہوتے ہیں جبکہ دوسری جانب حکومت وقت کے پاس پولیس سے لے کر مسلح افواج تک ہر قسم کے جدید اسلحہ سے لیس منظم و ہمہ وقتی ادارے موجود ہوتے ہیں جو حکومت وقت کے ایک اشارے پر آن واحد میں سب کچھ تہہ و بالا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اب ان حالات میں مسلح تصادم عملی طور پر تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ موجودہ صورت حال کے مطابق حکمت عملی یہ ہوگی کہ اقدام کے مرحلے پر جبکہ دعوت و تنظیم اور تربیت کا کام مکمل ہو چکا ہو تو انقلابی جماعت برائی کو طاقت کے ذریعے روکے گی۔ وہ برملا اعلان کرے گی کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے ہم اسے نہیں ہونے دیں گے۔ یہ منکرات ہمارے جیتے جی نہیں ہو سکتے۔ یہ کام ہماری لاشوں پر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ایسے منکرات کو ہدف بنایا جائے گا جن کے بارے میں کسی فقہی مکتب فکر کو اختلاف نہ ہو اور سب اس کو منکر (برائی) تسلیم کرتے ہوں، جیسے سودی نظام یا فحاشی و عریانی۔ یہ ہے ایک مسلمان ملک میں اسلامی نظام کے قیام اور منکرات کے خاتمے کا اصل طریق کار۔ اور یہی نہی عن المنکر یعنی برائی کو روکنے اور اسے مٹانے کا نبوی طریق کار ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اس پر فرض ہے کہ اسے ہاتھ سے (یعنی طاقت سے) روک دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے (منع کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے (برا سمجھے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" انقلابی تبدیلی کے لئے اس حدیث نبویؐ پر اجتماعی عمل ناگزیر ہے۔

منکرات کے خلاف مظاہروں اور پکٹنگ (PICKETING) کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ کیا آج لوگ اپنے سیاسی و سماجی اور معاشی حقوق حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ نہیں کرتے؟ آخر ہڑتال کیوں ہوتی ہے؟ مظاہرے کس لئے ہوتے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ دنیا حاصل کرنے کے لئے ہی باقی رہ گیا ہے؟ ہرگز نہیں! تمدن کی اس تبدیلی کو یکساں طور پر دین کے لئے

بھی استعمال کیا جاسکتا ہے' بلکہ استعمال کیا جانا ضروری ہے۔ البتہ اس کے لئے ایک شرط ملحوظ رکھنی ہوگی اور یہی شرط کامیابی کی ضمانت ہے۔ اور وہ یہ کہ جلسے جلوس' مظاہرے' ہڑتال اور گھیراؤ یہ سب کچھ پرامن ہو کر کیا جائے گا۔ کسی قسم کی توڑ پھوڑ منزل کو کھوٹا کرنے کے مترادف ہوگی۔ ٹریفک کے اشارے اور گاڑیوں کے شیشے توڑ دینا' سرکاری املاک اور حکومت کے زیر انتظام چلنے والی بسوں کو آگ لگا دینا وغیرہ سب کمیونسٹوں کے ہتھکنڈے ہیں۔

انقلابی جدوجہد کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ایران کی ہے۔ پہلے تو شاہ کے حکم سے پولیس اور فوج نے انقلاب کے علمبرداروں پر مظالم کی حد کر دی لیکن جب انقلابیوں کے شانہ بشانہ عوام الناس کی اکثریت بھی سڑکوں پر نکل آئی تو اُسی پولیس اور فوج نے نہتے عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے سے انکار کر دیا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو شہنشاہ ایران جیسے جابر و قاہر حکمران کو اپنی جان بچانے کے لئے ملک سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی[1] یہی صورت حال ۱۹۷۷ء میں نظام مصطفیٰ کی تحریک کے موقع پر پیدا ہوئی کہ فوج نے عوام پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے ٹھیکے داروں کی منافقت آڑے آئی اور نتیجۃً مارشل لاء دیکھنا پڑا۔

الغرض باطل نظام کی تبدیلی اور اسلام کے نظامِ عدل وقسط کا نفاذ صرف اور صرف ایسی انقلابی جدوجہد کے ذریعے ممکن ہے' جو انقلاب نبویؐ کی طرز پر کی جائے۔ انتخابات کے ذریعے اسلام کا نفاذ محال مطلق ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ کو عوام سے ووٹ لینے ہیں تو آپ ان کے غلط عقائد و اعمال پر تنقید نہیں کر سکتے۔ پھر اسلام کے نام پر ووٹ مانگیں گے تو کوئی دوسری جماعت بھی اسلام ہی کے نام کو استعمال کر سکتی ہے۔ تو کیا ہر جماعت کو اپنا اسلام علیحدہ نہیں کرنا ہوگا؟ اور اس طرح کئی اسلام وجود میں نہیں آجائیں گے؟ ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا سب سے بڑا اور اہم سبب مذہبی جماعتوں کا انتخابی سیاست میں حصہ لینا ہی ہے۔ ویسے بھی پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ انتخابی سیاست میں مذہبی جماعتیں کبھی بھی فیصلہ کن اکثریت حاصل نہیں کر سکتیں' لہٰذا انقلابی طریق کار اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔

اب ہمیں اس پوری انقلابی جدوجہد کا حاصل بیان کرنا ہے جسے ہم نے گزشتہ صفحات میں پیش کیا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ یہاں انقلاب ایران کی مثال محض انقلابی جدوجہد کی مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے' نہ کہ اسلامی انقلاب کی مثال کے طور پر۔ (ادارہ)

اسلامی انقلاب کے ثمرات یا منشور اسلام

اسلام کا انقلابی نظریہ توحید ہے، مکمل ترین اور خالص ترین توحید جسے آپ "توحید عملی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس توحید عملی کے تین شعبے ہیں۔ سیاسی سطح پر انسانی حاکمیت کی کلی نفی اور اس کی بجائے خلافت کا تصور۔ معاشرتی سطح پر طبقاتی تقسیم کی نفی اور کامل انسانی مساوات کا تصور۔ اور معاشی سطح پر انسانی ملکیت کی بجائے امانت کا تصور۔ اب ہم انہی تین سطحوں کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت انسانی..... سیاسی سطح پر توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کا اور اس کے سب رہنے والوں کا نہ صرف پیدا کرنے والا اور مالک ہے بلکہ حکومت و فرمانروائی کا اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے۔ یعنی وہ صرف طبعی اختیار ہی کا مالک نہیں بلکہ سیاسی و آئینی اقتدار کا بھی مالک ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان فرمایا۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ۔ آگاہ ہو جاؤ کائنات کا خالق بھی وہی ہے (مالک بھی وہی ہے) اور حکم بھی اُسی کا چلتا ہے۔ توحید کا اصول انسانی حاکمیت کی کلی نفی کرتا ہے، خواہ یہ حاکمیت ایک فرد واحد کی ہو یا ایک خاندان، ایک طبقہ، ایک پارٹی، یا پوری قوم کی (جاکمیتِ عوام) ہو۔ ایک فرد، ایک پارٹی، ایک قوم تو کیا پوری دنیا کے انسان بھی جمع ہو کر یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ خدا کے نازل کردہ قوانین میں اپنی مرضی کے مطابق کسی قسم کی تبدیلی کر سکیں۔ چنانچہ اسلام انسان کے لئے حاکمیت نہیں بلکہ خلافت کا تصور پیش کرتا ہے۔

خلافت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنے خالق و مالک کی مرضی کو پورا کرے جو خدا کے نائب ہونے کی حیثیت سے اس پر فرض ہے۔ یہ نیابت و خلافت کسی مخصوص فرد، گروہ یا قوم کو نہیں سونپی گئی بلکہ اس کا حق ہر وہ شخص رکھتا ہے جو توحید، رسالت اور آخرت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر کے نیابت و خلافت کی شرائط پوری کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان اپنی آزاد مرضی سے اپنے میں سے خلافت کے لئے موزوں ترین شخص کو خلیفہ منتخب کریں گے۔ اسے خلافت عامہ کہا جاتا ہے اور یہ شہنشاہیت، پاپائیت اور لادینی جمہوریت کے برعکس اسلامی جمہوری رنگ رکھتی ہے۔ خلافت کے اسلامی تصور اور مغربی جمہوریت میں فرق یہ ہے کہ مؤخرالذکر میں عوام کے نمائندوں کی حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس اسلام کی شورائی خلافت میں عوام کے لئے اُن کے نمائندوں کے ذریعے سے صرف خلافت و نیابت کو

تسلیم کیا جاتا ہے چنانچہ ایک اسلامی ریاست مغربی ریاست کی طرح مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہو سکتی بلکہ اُسے ہر آن اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے دائرے کے اندر رہنا ہوتا ہے۔

خلافت کا مقصد اسلام نے یہ متعین کیا ہے کہ وہ بھلائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کا خاتمہ کرے جن کا وجود انسانی زندگی میں خالق کو ناپسند ہے۔ اسلامی ریاست کی یہ قطعی پالیسی ہے کہ اُس کی سیاست بے لاگ انصاف' بے لوث سچائی اور کھری ایمانداری پر قائم ہو اور وہ ملکی' انتظامی یا قومی مصلحتوں کی خاطر جھوٹ' فریب اور بے انصافی کو کسی حال میں بھی گوارا کرنے پر تیار نہ ہو۔

۲۔ **ملکیت کی بجائے امانت**..... معاشی و اقتصادی شعبہ میں نظریہ توحید کا فطری نتیجہ جسے اس دور میں کھول کر بیان کرنے کی ضرورت ہے' وہ انسان کی ملکیت مطلقہ کی کلی نفی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم مطلق نہیں' اسی طرح اس کے سوا کوئی مالک مطلق نہیں۔ گویا ہر شے کا مالک حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

قرآن مجید اور احادیث شریفہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو مال کمانے اور رکھنے کی کھلی اجازت نہیں دیتا بلکہ اکتساب مال کے بعض ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے اور بعض کو ناجائز۔ وسائل معاش میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی اساس یہ ہے کہ ایسے تمام ذرائع جن میں دوسرے شخص کی مجبوری' ضرورت' سادہ لوحی' یا ناتجربہ کاری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر یا دھوکہ دہی اور جبر کے ذریعے کسی کا مال ہتھیا لیا گیا ہو' شریعت میں ممنوع اور خلاف قانون ہیں۔ سود' جوا' ذخیرہ اندوزی' رشوت' بلیک مارکٹنگ اور دیگر ہر قسم کی دھاندلیاں بھی اسلام میں حرام ہیں۔ ان ذرائع سے کمایا ہوا روپیہ اگر راہ خدا میں بھی خرچ کر دیا جائے تو اس کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ ایسے رزق سے جسم میں جو قطرۂ خون بنتا ہے اور جو گوشت پوست وجود میں آتا ہے' ارشاد مصطفویؐ کے مطابق وہ جہنم میں جلایا جائے گا۔ اسلام نے وہ تمام راستے بند کر دیئے ہیں' جن کے ذریعے ظالمانہ سرمایہ داری کو غذا پہنچتی ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کی آمد و خرچ پر کئی ایک پابندیاں ہیں۔ جو مال ناجائز طریقہ سے حاصل کیا جائے گا وہ ضبط کر لیا جائے گا مگر جو کچھ جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہے اُسے بھی خرچ کرنے کے معاملے میں انسان آزاد نہیں ہے۔ یہ مال اس کے پاس اللہ کی امانت

ہے اور اسے اس میں جائز تصرف کا حق دیا گیا ہے۔ اگر اس میں ناجائز طریقے سے تصرف کریگا تو حق تصرف بھی ختم ہو جائے گا۔ غور کیجئے معاشی سطح پر یہ کتنا عظیم انقلاب ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ ۔

ایں امانت چند روزہ نزدِ ما است درحقیقت مالکِ ہر شے خدا است

اور بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

بندۂ مومن ایں، حق مالک است غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

اسلامی ریاست ہر شہری کی بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کی ذمہ دار ہے۔ یہ بنیادی انسانی ضروریات رہائش کے لئے مکان، زندہ رہنے کے لئے غذا، سردی اور گرمی سے بچاؤ کے لئے مناسب لباس، دین و دنیا کے علم کے لئے تعلیم، جسم کو لاحق بیماریوں سے نجات کے لئے علاج اور انسانی نسل کے سلسلے کو قائم و جاری رکھنے اور جنسی خواہش کو جائز طریقے سے پورا کرنے کے لئے شادی جیسی ضروریات پر مشتمل ہیں۔ ان ضروریات کی فراہمی اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ میں اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے باز پرس ہوگی۔ گویا معاشی سطح پر دولت کی منصفانہ تقسیم کے بغیر اسلامی انقلاب ادھورا اور نامکمل رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تقویٰ و نیکی کو بھی معاشی کفالت سے مشروط کیا ہے۔ قرآن سورۃ المدثر میں بڑے مؤثر پیرائے میں اس حقیقت کو ایک انقلابی انداز میں بیان کرتا ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے پوچھیں گے (ترجمہ) "تمہیں کون سا جرم دوزخ میں لے گیا تو وہ جواب دیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔" گویا قرآن مجید کی نظر میں نماز ادا نہ کرنا اور کسی غریب کو ضروریات زندگی بہم نہ پہنچانا دونوں یکساں نوعیت کے جرائم ہیں۔ بلکہ سورۃ الماعون میں بڑی وضاحت سے بیان فرمایا کہ "جو شخص یتیموں (بے سہارا) کی توہین کرتا ہے ان کو اپنے ہاں سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور غرباء و مساکین کی ضروریات زندگی کو بہم پہنچانے کی ترغیب نہیں دلاتا وہ قیامت پر یقین ہی نہیں رکھتا۔" جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق سے غریبوں کی امداد نہیں کرتے اور ان کی ضروریات کی فراہمی میں اپنا فرض ادا نہیں کرتے ان کے بارے میں قرآن مجید کا دل ہلا دینے والا ارشاد سنئے۔ (ترجمہ) "اس کو پکڑ لو، پس اس کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر اُسے بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔ پھر اسے ستر گز لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ (بدبخت) خدائے ذوالجلال پر ایمان نہیں لایا تھا اور نہ ہی وہ غریبوں کو خوراک مہیا کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔" (الحاقہ) ان آیات میں جو رعب اور جلال ہے اس

سے دل کانپ اٹھتا ہے' رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک منصف مزاج انسان پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی مادی ضرورتوں کو انتہائی اہمیت دی ہے۔ اسلام نے صرف اخلاقی وعظ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قانونی طور پر ضرورت مند لوگوں کی کفالت کو اسلامی معاشرہ پر لازم قرار دیا ہے۔

توحید کے معاشی پہلو کے آخر میں ہمیں پاکستان کی زرعی اراضی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی اکثر زمین مسلمان فاتحین نے بزور شمشیر فتح کی ہے۔ ایسی مفتوحہ زمین خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ زمین تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت (یعنی بیت المال کی) ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی انقلاب کے بعد ملک میں قائم بدترین جاگیرداری نظام کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جو تمام خرابیوں کا سرچشمہ ہے اور یوں پورا ملک ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست کا روپ دھار کر دنیا کو اسلام کے قوانین کی برتری دکھا اور منوا سکے گا۔ ؏

گر یہ نہیں تو بابا سب کہانیاں ہیں

کامل انسانی مساوات

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جہاں ایک طبقہ خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا دعویٰ کر کے لوگوں پر حکومت کرتا رہا ہے اور جہاں انسان ملکیت مطلقہ کی ضلالت میں مبتلا رہا ہے وہاں وہ اس گمراہی میں بھی ٹھوکریں کھاتا رہا ہے کہ انسانوں میں ذات پات اور اونچ نیچ کی تقسیم ہے جبکہ معاشرتی سطح پر توحید کا تصور یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور ان کے مابین کوئی طبقاتی تقسیم نہیں۔ یہ رنگ و نسل اور یہ ذات پات کی تقسیم اور برہمن کا شودر پر' سید کا غیر سید پر اور وڈیرے کا مزارع پر بڑائی اور برتری کا دعویٰ سب باطل ہے۔ یہ ساری تقسیمیں غلط ہی نہیں موجب فساد بھی ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں۔ اس لئے کہ سب کا خالق ایک اللہ ہے اور سب ایک انسانی جوڑے آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ ہاں اگر کوئی فضیلت ہے تو نیکی و تقویٰ اور اعلیٰ سیرت و کردار کی بنا پر ہے اور اس کا معاملہ بھی آخرت میں ہو گا۔ دنیا میں تمام انسان سماجی سطح پر کامل مساوات رکھتے ہیں۔ ع تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے۔ یہاں نہ کوئی حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور نہ محکوم رہنے کے لئے۔ اسلام سماجی سطح پر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جو رنگ و نسل اور زبان کی

حد بندیوں کو توڑ کر توحید کے ماننے والوں کی ایک عالمی برادری کو معرض وجود میں لا سکے۔ الغرض اسلام انسان کے خلاف انسانی ظلم کو مٹانے کا حکم دیتا ہے اور سماجی سطح پر توحید کا تقاضا یہی کامل سماجی مساوات ہے۔

حاصل کلام

تاریخ اسلامی کا یہ عجیب المیہ ہے کہ اسلام دین حق ہونے کے باوجود آج غالب و نافذ نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے اعمال کی تصویر میں اتارنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ جمہوریت اگرچہ ایک فریب و جھوٹ ہے مگر یہ اس لئے غالب و نافذ ہے کہ اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے والے بے شمار افراد موجود ہیں۔

اسلام کو سربلند دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی جملہ خود مختاریوں سے آزاد ہو کر خدا تعالیٰ کے مطیع و فرمان بندے بن جائیں ——— اور اسے دنیا میں انقلابی جدوجہد کے ذریعے نافذ و غالب کرنے کے لئے تن، من، دھن نچھاور کرنے پر آمادہ ہوں۔

۔ اگر باطل نظام اپنی قوت و فطرت کے لحاظ سے انتہائی دھرم واقع ہو کہ اس خالص انسانی اور بے لوث کام میں خواہ مخواہ رکاوٹ ڈالے ——— تو ظلم و فساد کو مٹانے کے لئے اسے پنجہ آزمائی کر کے اسلام کے عدل اجتماعی کو نظام کی حیثیت سے غالب و نافذ کرنے کی انقلابی جدوجہد میں حصہ لینا ہو گا یہ کام دنیا کا نہایت کٹھن اور مشکل کام ہے۔

لیکن دین حق کو بالفعل قائم کرنا چونکہ مسلمانوں کے مقصد وجود کا بنیادی تقاضا ہے لہٰذا اس کو سرانجام دینے کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد ہوتی ہے جو کہ اس نظام کو ماننے کے دعوے دار ہیں۔ زندگی کے جتنے نقشے دوسروں کے پاس تھے وہ ان کو آزما کر دیکھ چکے اور ناکام ہو چکے، اب صرف اور صرف اسلام کا نقشہ باقی ہے جو ماضی میں آزمانے پر پورے طور پر کامیاب ثابت ہوا اس لئے آج پھر اسے نافذ و غالب کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ انسانیت کا قافلہ جو آج اپنوں اور بیگانوں کی چیرہ دستیوں سے لٹ رہا ہے زبانِ حال سے کہہ رہا ہے صرف کہہ ہی نہیں رہا بلکہ ہر روز مطالبہ کر رہا ہے کہ ؎

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!

★★★

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَا اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَاۤ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعۡفُ عَنَّا وَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنۡتَ مَوۡلٰٮنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

عطیہ اشتہار

میاں عبدالواحد

نجگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور

(دوسری قسط)

آخرت پر ایمان

محمد غوری صدیقی

دنیا و آخرت ایک وحدت ہیں

آخرت کے یقین نے ہی (جو کہ اللہ کی توحید اور رسالت پر ایمان ہی کا نتیجہ ہے) صحابہ کرامؓ کی نگاہوں میں دنیا کو ہیچ بنا دیا تھا۔ دنیا کی ہر شے کے مقابلے میں ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا عزیز تھی۔ راہِ حق میں موت جان سے زیادہ پیاری تھی۔ ان کو حضورؐ کے اس فرمانِ مبارک پر کامل یقین تھا کہ الدنیا مزرعة الآخرة کہ "دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے"۔ بونا یہاں ہے اور کاٹنا آخرت میں ہے۔ دنیا بذاتہٖ مقصود نہیں ہے۔ یعنی حقیقت میں دنیا اور آخرت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلہ ہے کہ جس کی ابتدا دنیا ہے اور انتہا آخرت ہے۔ ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو کھیتی اور فصل میں ہوتا ہے۔ آپ زمین میں جس چیز کی کاشت کریں گے اسی کی فصل تیار ہوگی۔ اور ہل چلانے' بیج بونے' پانی دینے اور کھیتی کی رکھوالی کرنے میں جو غلطیاں اور کوتاہیاں آپ کریں گے ان سب کا برا اثر آپ کو فصل کاٹنے کے موقع پر معلوم ہوگا۔ دنیا کی کھیتی کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں کام کرنے کے لئے انسان کو عمر اور کچھ تھوڑا بہت ساز و سامان اور قوتیں دی گئی ہیں۔ یہاں کی نیکیاں' اللہ اور رسولؐ کی اطاعت' اور اللہ کی راہ میں مال و جان کا جہاد آخرت میں اچھی فصل تیار کریں گے جو جنت اور اس کی نعمتوں کی صورت میں ہوگی۔ غفلت' نفس پرستی' معصیت ظلم و کفر اور دین کے لئے محنت سے فرار بری فصل تیار کریں گے جو جہنم کے مختلف عذابوں کی شکل میں ہو گی۔

حیاتِ دنیوی و سامانِ دنیا کا آخرت سے موازنہ

قرآن و حدیث کی روشنی میں دنیا اور اس کے ساز و سامان کی چار حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) دنیا دار الامتحان ہے۔ یہ دار الجزاء نہیں ہے۔ یہاں اخلاقی اعمال کی جزا و سزا اگر

ہے بھی تو بہت محدود اور ناقص صورت میں ہے اور امتحان کا پہلو خود اس میں بھی موجود ہے۔ سورۃ الملک میں فرمایا اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً لَّھَا لِنَبْلُوَھُمْ اَیُّھُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ○

کہ جس نے موت و زندگی کو بنایا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین میں ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

اسی لئے حضورؐ نے فرمایا "الدنیا سجن المؤمن وجنّۃ الکافر" "دنیا تو مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔ مومن شریعت کا ہمہ وقتی قیدی ہے' کافر آزاد۔

(۲) دنیا کی دوسری حیثیت..... دنیا کی زندگی انتہائی محدود اور فانی اور حقیر و قلیل ہے جبکہ آخرت کی زندگی لامحدود' غیر فانی اور عظیم و کثیر ہے۔ فرمایا

"کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ" (القرآن)

"ہر نفس (انسان) نے موت کا مزہ چکھنا ہے"۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ○ (الرحمٰن)

اس زمین پر جو بھی ہے فانی ہے اور بقاء صرف ترے رب کو ہے جو ذوالجلال والاکرام ہے۔

حضورؐ نے فرمایا "واللہ ماالدنیا فی الاخرۃ الا مثل مایجعل احدکم اصبعۃ فی الیم فلینظر بم یرجع (مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

حضورؐ نے فرمایا۔ "اللہ کی قسم دنیا کی حقیقت آخرت کے مقابلے میں اتنی سی ہے کہ جیسے تم میں سے کوئی سمندر میں اپنی انگلی ڈبوئے تو ذرا دیکھے تو۔"

حضورؐ نے فرمایا کہ "پوری دنیا کی حیثیت اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے ورنہ کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نہ ملتا"۔ دنیا کا یہ سروسامان اللہ کے نزدیک کوڑے کرکٹ کی طرح ہے چنانچہ نافرمانوں اور کافروں کے پاس یہ زیادہ ملتا ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بھیڑ کے بچے کے پاس سے گزرے جس کے کان نہ تھے اور وہ مرا پڑا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کون پسند کرے گا کہ یہ بھیڑ کا بچہ اس کو ایک درم میں مل جائے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم کو تو یہ مفت میں بھی منظور نہیں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم اللہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ سورۃ المؤمنون میں ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ دنیا میں قیام کی مدت کے بارے میں لوگوں سے دریافت فرمائیں گے تو جواب ملے گا۔

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ ○

وہ کہیں گے (رہے دنیا میں) ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ پس شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے۔

۳۔ تیسری حیثیت..... دنیا کی زندگی اور اس کا ساز و سامان اپنے ظاہر کے لحاظ سے غافل اور ناکام کرنے والا ہے' اس لئے حقیر اور دھوکے کا سامان ہے۔ متاعِ غرور ہے۔

۴۔ چوتھی حیثیت..... دنیا کی زندگی اور اس کا ساز و سامان ہی آخرت بنانے اور کمانے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا یہاں کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک چیز آخرت کے حوالے سے قیمتی ہے۔ چنانچہ یہ متاعِ حسن ہے۔

قرآن مجید کی رو سے دنیا کا سامان دو قسم کا ہے۔ ایک وہ جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو فتنے میں ڈالنے کے لئے دیا جاتا ہے اور جس سے دھوکا کھا کر ایسے لوگ اپنے آپ کو دنیا پرستی اور خدا فراموشی میں گم کر دیتے ہیں۔ یہ بظاہر نعمت لیکن حقیقت میں خدا کی پھٹکار اور عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ یہ متاعِ غرور ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

جن لوگوں نے انکار کیا اور آخرت کو جھٹلایا اور ہم نے ان کو موجودہ زندگی میں نعمت دی۔

اور جب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو تو حکم بھیج دیا اس کے امیروں مالداروں کو۔ پس انہوں نے اس میں نافرمانی کی پھر حق ثابت ہوئی ان پر بات اور ہم نے ان کو اکھاڑ پھینکا۔ اور متاعِ حسن وہ سرو سامان دینا ہے جس سے انسان قوی اور خوشحال ہو کر اپنے خدا کا شکر کرتا ہے۔ اس کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حقوق اور زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے۔ یہ قرآن کی زبان میں متاعِ حسن ہے۔ یعنی ایسا اچھا سامانِ زندگی جو محض عیشِ دنیا پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ عیشِ آخرت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

وَ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا

اور اگر تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ گویا اللہ کے نیک بندے دنیا کے سروسامان کو بھی آخرت کے داؤ پر ہی لگاتے ہیں۔

انسان کی حقیقی اور ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان اپنے اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی راہ میں جہاد کی محبت کے تقاضوں کو ہمیشہ ترجیح دے اور مقدم رکھے اور دنیا اور اس کی مصروفیات کو پیچھے کر دے۔ آخرت کی کامیابی کا فیصلہ اسی تقدیم و تاخیر کے رویہ پر کیا جائے گا۔ سورۃ القیامہ میں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ○

اس دن انسان کو بتلا دیا جائے گا کہ وہ (دنیا میں) کس کو مقدم اور کس کو مؤخر کیا کرتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس زمین پر سب سے بہترین جگہیں مساجد ہیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ کو سجدے کئے جاتے ہیں اور بدترین مقامات بازار ہیں کہ جہاں دنیا مختلف رنگا رنگ اور دلفریب صورتوں میں انسان کو اپنے اندر گم کرنے کے لئے موجود ہوتی ہے۔ حضورؐ نے اسی لئے بازاروں میں کم سے کم جانے کی تلقین فرمائی ہے۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جو شخص دنیا سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل میں دانائی کی جڑ جما دیتا ہے۔ اس کی زبان سے عقلمندی کی باتیں نکلنے لگتی ہیں۔ اللہ اس پر دنیا کے عیب کو ظاہر کر دیتا ہے"۔ (المشکوٰۃ کتاب الرقاق)

حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آدمی کا ان چیزوں کے سوا کسی چیز میں کوئی حق نہیں ہے۔ (۱) رہنے کے لئے گھر۔ (۲) ستر ڈھانکنے کو کپڑا۔ (۳) کھانے کے لئے سوکھی روٹی۔ (۴) پینے کو پانی۔

حضورؐ نے دنیا کی حقیقت اور اس میں صحیح طریقہ زندگی کو ذیل کی حدیث میں خوب کھول کر بیان کر دیا اور سمجھا دیا کہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں سے ایک دن چلے جانا ہے۔ دل تو صرف اپنے مقصد زندگی سے اور جہاں جا کر ہمیشہ رہنا ہے اس سے لگانا چاہئے۔ فرمایا۔

كن فيالدنيا كانك غريب او عابر سبيل وعد نفسك فى اهل القبور (مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

یعنی "دنیا میں اس طرح رہو جیسے تم اجنبی ہو یا راہ چلتے مسافر ہو اور خود کو قبر والوں میں شمار کرو"۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا

"یقول العبد مالی مالی و ان ماله من ماله ثلث ما اکل فافنی او لبس فابلی او اعطی فاقنی وما سوی ذالک فهو ذاهب وتارکه للناس"

فرمایا "انسان کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال مگر حقیقت میں جس کو اس کا مال کہہ سکتے ہیں وہ تین قسم سے زیادہ کا نہیں ہے۔ جو اس نے کھا کر فنا کر دیا۔ جو اس نے پہن کر بوسیدہ کر دیا۔ اور جو اس نے اللہ کے واسطے دے دیا اور اپنے لئے آخرت کا ذخیرہ بنالیا۔ اس کے سوا جو باقی رہا وہ اس کو لوگوں کے واسطے چھوڑ کر خود چل بسے گا اور وہ مال دوسروں کا ہو جائے گا۔

دنیا کی زندگی گزارنے کا طریقہ حضورؐ کے ایک واقعہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ حضورؐ کے گھر ایک بکری ذبح ہوئی۔ حضورؐ گھر سے باہر تشریف لے گئے۔ واپس آکر حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا۔ "ما بقی منها" "اس میں سے کیا باقی بچا"۔ حضرت عائشہؓ نے سارا گوشت راہ خدا میں بانٹ دیا تھا اور دستی کا گوشت جو حضورؐ کو مرغوب تھا بچالیا تھا۔ بولیں کہ "ما بقی منها الا لتفها" "کچھ باقی نہیں بچا سوائے دستی کے (گوشت)"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ! "بقی کلها الا کتفها" "سب کچھ بچ گیا سوائے دستی کے (گوشت کے)"۔ اس کو تو ہم کھا کر فضلہ بنا دیں گے جو اللہ کی راہ میں دیا گیا وہ درحقیقت بچ گیا اور اللہ کے خزانے میں محفوظ ہو گیا۔ "فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا" (جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے) پس وہ (اللہ) اس کو اس کے لئے دوگنا چوگنا بڑھاتا ہے"۔ گویا انسان اپنی جان و مال، وقت، صلاحیت، عزت، اولاد غرض کہ جو کچھ اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا ہے اس میں سے جو اللہ کی راہ میں لگ کر کھپ جائے گا وہی قیمتی اور محفوظ ہو کر اس کو آخرت میں واپس ملے گا۔ "مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" "کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے"۔ اپنی راہ میں خرچ کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض حسن قرار دیتے ہیں۔

حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ قیامت کے دن دنیا ایسی بدشکل بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی کہ لوگ اس کو دیکھ کر کہیں گے کہ "اس سے اللہ کی پناہ!" تب فرشتے کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جس پر تم لٹو اور فریفتہ تھے۔ لوگوں کو ایسی ندامت ہوگی کہ چاہیں گے ہمیں آگ کھالے اور ختم کر دے۔

(جاری ہے)

ہر قسم کے بال بیرنگز کے مرکز

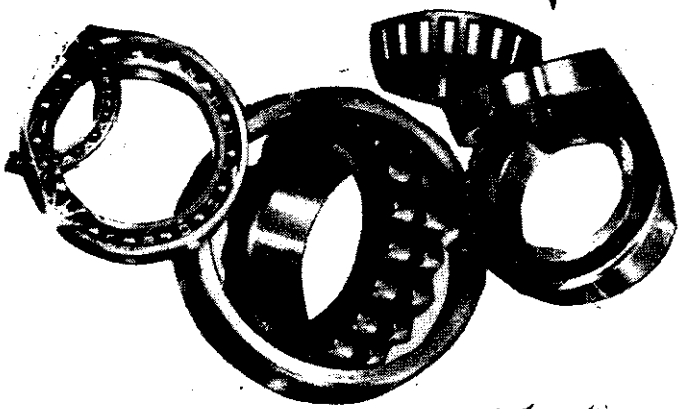

سندھ بیرنگ ایجنسی ۔ ۶۵ ۔ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز ۔ کراچی ۔ فون: ۷۲۳۳۵۸ ۷۲۱۱۷۲

خالد ٹریڈرز ۔ بالمقابل کے ۔ ایم ۔ سی ورکشاپ ۔ نشتر روڈ ۔ کراچی

فون: ۷۳۵۸۸۳ — ۷۳۲۹۵۲ — ۷۳۰۵۹۵

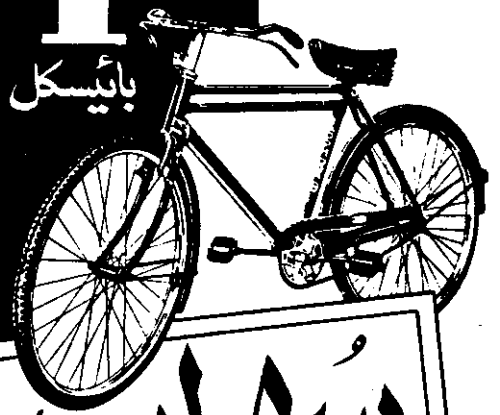

طلبائے تنظیم اسلامی کے پہلے آل پاکستان کنونشن کی رُوداد

مرتبہ: چوہدری غلام محمدؐ

یہ بات معلوم و معروف بلکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوجوان ہر انقلابی تحریک کے روحِ رواں اور ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ وہ طبعاً گھسے پٹے مروجہ طریق کار پر آنکھیں بند کر کے کاربند رہنے کی بجائے اولاً غور و فکر کے بعد اس کی صحت اور حقانیت پر اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اگر دل گواہی دے دے اور عقل اس کی درستگی کو تسلیم کرے تو وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس راہ پر چل نکلتے ہیں۔ بالخصوص ذہین نوجوان فطرتاً نظامِ کہنہ کے بالقصد باغی اور اس کے حسن و قبح پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے لئے مضطرب ہوتے ہیں۔ ان میں نئی فکر، نئی سوچ کو قبول کرنے کا داعیہ ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں جو عملی تقاضے ابھرتے ہیں ان کی طرف پیش قدمی میں بھی وہ پس و پیش نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ معمر لوگوں کی طرح اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار اور مزاجاً سود و زیاں اور مصلحتوں کے پرستار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انقلابی تحریک کو لبیک کہنے والوں میں بالعموم نوجوانوں کی اکثریت ہوتی ہے اور انہی کا جوش و جذبہ اور محنت و پیش قدمی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سبب بنتی ہے۔ الحمدللہ تنظیم اسلامی کی پکار پر لبیک کہنے والوں میں بھی نوجوانوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے۔ یہ نوجوان رفقاء دوسرے رفقاء کے دوش بدوش طے شدہ طریق کے مطابق دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شریک رہے ہیں تاہم ان کی جانب سے یہ مطالبہ پیش کیا جاتا رہا ہے کہ نوجوان طالب علموں کی اپنی مخصوص افتادِ طبع اور جداگانہ دائرۂ کار کی بنا پر ان کے لئے ایک الگ نظم ہونا چاہئے۔ یہ موضوع کچھ عرصہ سے تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت کے زیر غور رہا۔ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ اس کی ضرورت و اہمیت واضح طور پر سامنے تھی تاہم بعض خدشات بھی تھے، جن سے ماضی قریب کی بعض ملکی و غیر ملکی جماعتوں کو سابقہ

درپیش آیا۔ علیحدہ نظم کی صورت میں تحریک میں ایک متوازی بلکہ متضاد فکر کے ابھرنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور ایسے مواقع بھی پیدا ہوسکتے ہیں جبکہ جذبات واحساسات کی جداگانہ سطح کی بنا پر ایک ہی تحریک کے دو شعبوں کی جداگانہ قیادتوں کے فیصلے مختلف ہوں۔ لہٰذا فیصلہ یہی کیا گیا کہ ایک الگ تنظیم کی بجائے تنظیم اسلامی کی مرکزی قیادت ہی کے تحت تنظیم اسلامی سے وابستہ طلبا کا ایک حلقہ قائم کیا جائے، جس کا نام "طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان" ہو اور جس کے ذریعہ طالب علم رفقائے تنظیم کا کل پاکستان بنیاد پر باہم ربط و تعلق ہو۔ اور اس پلیٹ فارم سے ان کو اپنی صلاحیتیں پروان چڑھانے اور بروئے کار لانے کے بھرپور مواقع فراہم کئے جائیں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ وہ ہنگامی مسائل اور انتخابی سیاست سے علیحدہ رہتے ہوئے انقلابی مشن کے لئے اپنے سیرت و کردار میں پختگی پیدا کریں۔

طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے حلقہ کو منظم اور فعال بنانے کے لئے ۱۴ر ۱۵ر ستمبر کو قرآن اکیڈمی لاہور میں طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے پہلے سالانہ کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ پاکستان کے دور دراز مقامات سے مندوبین ۱۴ر ستمبر بدھ کی صبح ہی سے قرآن اکیڈمی لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق اسی روز شام کو جناح ہال لاہور میں امیر تنظیم اسلامی کا خطاب عام تھا۔ لیکن بعض انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے یہ پروگرام ۱۵ر ستمبر جمعرات شام تک ملتوی کرنا پڑا، جس کی وجہ سے بعض شرکاء کو بہت دقت ہوئی۔ ۱۴ر ستمبر احباب و رفقاء نے باہم ملاقات، تبادلہ خیال اور مشوروں میں صرف کی۔ اور ۱۵ر ستمبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے پہلے سالانہ کنونشن کے باقاعدہ خصوصی اجلاس کا آغاز ہوا۔ محترم امیر تنظیم اسلامی نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ تلاوت کلام پاک سے آغاز کے بعد میاں محمد نعیم صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان نے طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے بارے میں مختصر تعارفی گفتگو کی۔ بعدازاں مختلف مقامات سے آئے ہوئے مندوبین اور احباب نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا اور مختصر تاثرات بیان کئے۔ مختلف مقامات کی کیفیات کا اندازہ ہوا، اہم معاملات پر مشورے ہوئے اور امیر محترم نے مناسب ہدایات دیں۔ طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے ذمہ دار حضرات کے تعین کے بارے میں مشورہ ہوا۔ اور اجلاس کے بعد مزید مشورہ کے بعد طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے ناظم اعلیٰ کی ذمہ داری انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے طالب علم منیر الحق حقی کو تفویض کر دی گئی۔ صوبہ سرحد کے ناظم کے طور پر خیبر میڈیکل کالج کے طالب علم حافظ محمد مقصود کا تقرر ہوا۔ ٹیکسٹائل انجینئرنگ کالج فیصل آباد کے طالب

علم غلام اصغر صدیقی صاحب کو پنجاب کا ناظم مقرر کیا گیا۔ لاہور کے ناظم کی ذمہ داری کے لئے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے طالب علم عبدالرؤف حیدر صاحب اور کراچی کے ناظم کی حیثیت سے اردو سائنس کالج کے سید یونس واجد صاحب کے تقرر کا فیصلہ ہوا۔

طلبہ تنظیم اسلامی کنونشن کے اس اجلاس خصوصی کے آخر میں جناب امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مختصر خطاب فرمایا۔ اقامت دین کی جدوجہد میں نوجوانوں کے مؤثر اور جاندار کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف نے ارشاد فرمایا کہ نوجوان طالب علموں کو اپنی صلاحیتوں کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اپنی ترجیحات متعین کر لینی چاہئیں تاکہ محنت اور جدوجہد صحیح رخ پر ہو اور کوششیں بار آور ہو سکیں۔ آپ نے خصوصی طور پر توجہ دلائی کہ نوجوانوں کے سامنے اپنا نظریہ زندگی اور نصب العین پوری طرح واضح ہونا چاہئے۔ دینی اصطلاحات میں ہم ان کو ایمان، محبت خداوندی، رضائے الٰہی کا حصول اور نجات اخروی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی کامیابی ہمارا ہدف نہیں۔ ہمیں اپنے فرائض دینی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے محنت کرنا ہے۔ دوسری اہم بات جس پر ہر طالب علم رفیق کو لازماً توجہ دینی چاہئے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کی اس قدر تعلیم ضرور حاصل کرے کہ قرآن مجید کو روانی سے پڑھتے ہوئے ترجمہ دیکھے بغیر مفہوم تک رسائی حاصل کر سکے۔ اگرچہ یہ تنظیم کے ہر رفیق کی ضرورت ہے۔ تاہم دوسروں کے لئے بعض حالات میں اس سے استثنا کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن طالب علم اس کو اپنے لئے فرض عین سمجھیں۔ قرآن مجید سے خصوصی تعلق ہماری دعوت کا سنگ بنیاد اور ہمارے جذبہ وایمان کی آبیاری کا واحد مستقل اور خطا سے پاک ذریعہ ہے۔ ہمارے وہ نوجوان ساتھی جنہوں نے شعوری طور پر دین وایمان کا راستہ اختیار کیا ہے اس کو حرز جان بنائیں۔

محترم امیر تنظیم نے طلبہ تنظیم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے پیش نظر کام کے دو شعبے ہیں، جو لازم وملزوم ہیں۔ اولاً علمی سطح پر احقاق حق اور ابطال باطل اور ثانیاً عوامی سطح پر ایک عملی جدوجہد اور حرکت۔ اس میں بھی اول الذکر اس پہلو سے اولیت کی حامل ہے کہ نظریاتی انقلاب کے بغیر محض عملی جدوجہد اور حرکت خواہ کس قدر بھرپور انقلابی انداز میں بھی ہو نتیجہ خیز نہیں ہوتی اور اگر کوئی عارضی نتیجہ برآمد بھی ہو جائے تو وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔ کسی انقلابی تحریک کے نتیجہ میں اعلیٰ سیاسی سطح پر بھی کوئی تبدیلی سودمند ثابت نہ ہو سکے گی اگر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں وہ لوگ موجود نہ ہوں جو علی وجہ البصیرۃ اس انقلابی نظریہ پر یقین رکھتے ہوں۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کے لئے ایسے لوگوں کی معتدبہ تعداد کا موجود ہونا اشد ضروری

ہے' جنہوں نے دین وایمان کا راستہ پورے یقین واعتماد سے اختیار کیا ہو۔ لہٰذا علمی سطح پر انقلاب برپا کرنے کی کوشش اہم تر ہے' اسی طرح عوامی سطح پر اگر عملی حرکت پیدا نہ ہو تو بھی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ محض علمی سطح پر کام کے نتیجہ میں مخصوص نظریات رکھنے والا ایک گروہ یا ایک مکتب فکر ہی وجود میں آسکتا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے طالب علموں پر زور دیا کہ وہ اپنی اپنی صلاحیتوں اور افتادِ طبع کا جائزہ لیں۔ باصلاحیت ذہین نوجوان جو تحقیقی اور تخلیقی کام کر سکتے ہوں اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کریں۔

ادب فلسفہ لٹریچر وغیرہ کے طالب علم اس کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ دینی تحریکوں کی جانب یہ لوگ کم متوجہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ان علوم کی تحصیل کے دوران ایمان وعقائد سے شدید تصادم درپیش ہوتا ہے۔ اس خطرناک وادی سے گزرتے ہوئے جنہوں نے ایمان ویقین تک اپنا راستہ محفوظ رکھا وہ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے لہٰذا ان کی ذمہ داری بھی دوچند ہے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فکر کے دھارے کا رخ موڑنا ہے۔ غلط نظریات کا ابطال دلیل وبرہان سے کرنا ہے۔ سائنس یا فنی علوم کے طلبا کے لئے بالعموم دعوت وتنظیم کا میدان زیادہ موزوں ہوتا ہے اور یہ بھی ایک مؤثر اور وقیع کام ہے' اس میں خلوص واخلاص کے ساتھ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاص اللہ تعالیٰ سے کہ اسی کی رضاجوئی پیش نظر ہے اور خلوص بندگان خدا سے کہ انہی کی بھلائی اور بہتری کے لئے انہیں قبول حق کی دعوت ہے۔

اس کے بعد جناب امیر تنظیم اسلامی نے طلبہ تنظیم اسلامی کو عملی سرگرمیوں سے متعلق بعض مشورے دیئے انہیں ہدایت کی کہ وہ تربیت گاہوں کا کثرت سے اہتمام کریں۔ تبلیغی سفر بھی ان کی تربیت کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گے۔ اپنے سیرت وکردار کی تعمیر پر خصوصی توجہ دیں۔ اپنی تعلیم گاہوں میں حسب سابق خاموشی سے اپنا کام جاری رکھیں۔ ہنگامہ آرائی یا کسی اور تنظیم سے تصادم یا مقابلہ ہمیں مطلوب نہیں۔ یونین کے انتخابات یا طلبا کے نام نہاد مسائل ہمارا موضوع نہیں اس ملک وقوم کو مسلمان ہونے کے حوالہ سے جو مسائل درپیش ہیں وہی طلبا کے مسائل ہیں آپ اپنے آپ کو مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لئے تیار کریں اور اپنی توانائیاں وقتی اور ہنگامی مسائل میں ضائع نہ کریں۔

۱۵ر ستمبر جمعرات بعد نماز مغرب جناح ہال لاہور میں اجلاس عام ہوا۔ جس میں طلبہ تنظیم اور دیگر رفقائے تنظیم کے علاوہ کثیر تعداد میں دوسری طلبہ تنظیموں اور تعلیمی اداروں سے

متعلق لوگ بھی شریک ہوئے۔ ہال ابتداء ہی میں پوری طرح بھر گیا۔ خالی جگہوں پر مزید کرسیاں لگائیں گئیں اور سٹیج سے ملحق جگہ پر بھی دریاں بچھائی گئیں۔ اس کے باوجود بھی لوگوں کو کھڑے ہو کر کارروائی سننا پڑی۔ غالباً لوگوں کے لئے یہ بات ایک خوشگوار حیرت کا موجب بنی تھی کہ ایک نئی طلبا تنظیم ایسے وقت میں منظرعام پر آرہی ہے جبکہ تعلیمی اداروں اور درسگاہوں کی فضا علم و آگہی کے نغموں کی بجائے ہنگامہ آرائی تصادم اور خونریزی سے مسموم ہے۔ لیکن اس تنظیم کا یہ مؤقف واضح طور پر متعین ہے کہ طلبہ تنظیم انتخابات اور سیاسی سرپھٹول سے اجتناب کرتے ہوئے ایمان و شرافت کی فضا میں اپنے سیرت و کردار کی تعمیر اور حصول علم میں منہمک رہیں گے۔ اجلاس کی صدارت امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کی اور سٹیج پر ان کے دائیں بائیں ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان میاں محمد نعیم صاحب اور ناظم اعلیٰ طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان جناب منیر الحق حقی متمکن تھے۔ امیر تنظیم اسلامی کے سامنے جواں سال رفقائے کار کی ایک کثیر تعداد اور دوسرے نوجوان سامعین کا ایک جم غفیر موجود تھا' جن کے چہرے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ایثار و قربانی کے عزم سے تابناک تھے۔ عجیب کیف کا عالم اور روح پرور نظارہ تھا۔ محترم امیر تنظیم سراپا سپاس نظر آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کی برس ہا برس کی محنت شاقہ اور عرق ریزی کو شرف قبول عطا کیا۔ خون جگر سے سینچے ہوئے ان بیل بوٹوں پر اب بہار کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اللھم زد فزد تلاوت کلام پاک کے بعد طلبہ تنظیم اسلامی کے ذمہ دار حضرات کو مختصر خطاب کی دعوت دی گئی۔ جناب غلام اصغر صدیقی صاحب ناظم صوبہ پنجاب نے واضح طریق سے طلبہ تنظیم اسلامی کے قیام کی غرض وغایت اور طریق کار پر روشنی ڈالی۔ حافظ محمد مقصود صاحب ناظم صوبہ سرحد نے دھیمے مدلل اور پرعزم انداز میں طلبہ تنظیم اسلامی کے مقاصد اور عزائم کا تذکرہ کیا۔ کراچی سے جناب نوید احمد صاحب نے پرجوش انداز میں فرائض دینی کو جامعیت سے بیان کیا۔ ناظم حلقہ لاہور جناب عبدالرؤف حیدر صاحب نے پرشکوہ' رواں اور برجستہ انداز میں دینی ذمہ داریوں کی تین سطحوں کے بارے میں کلام کیا اور طلبہ تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے ان کے لئے محنت و کوشش کے عزم کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ ان جواں ہمت رفقائے کار کا حامی و ناصر ہو اور اپنی خصوصی رحمت سے ان کے لئے نیکی اور سعادت کے راستے کشادہ کرے۔ آخر میں محترم امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں طلبہ کے فرائض و مسائل کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔ آپ نے

(باقی صفحہ ۹ پر)

معدے کی تیزابیت، بدہضمی اور بھوک کی کمی کے لیے

لیکوڈ
گیسٹوفل

تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

QD – 6

مولانا عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ

چند یادیں، چند تاثرات

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

ایوب خان مرحوم کا زلزلہ خیز دور آیا تو مری کے علاقہ کے ایک پیر صاحب نے دنیا کو باور کرانا شروع کیا کہ مرحوم میرے مرید ہیں۔ ان پیر صاحب کی عادت یہ تھی کہ راستہ چلتے گاڑی رکواتے، باہر نکلتے اپنے دوپٹہ سمیت سڑک پر نظریں جھکائے کھڑے ہو جاتے اور بعد میں کہتے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سواری جارہی تھی یا پھر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام لیتے کہ وہ گزر رہے تھے..... گویا وہ ایک نووارد نوجوان علامہ صاحب کے واقعی پیش رو تھے۔ ادھر کراچی کے ایک بڑے مولوی صاحب کے لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین مرحومین سے جو روابط شروع ہوئے انہوں نے ایوب خان کے دور میں مزید شدت اختیار کرلی..... چنانچہ پیر صاحب موصوف نے بحق ایوب خان اہل دین کو اکٹھا کرنے کی راہ نکالی تو مولوی صاحب نے اندرون سندھ اپنے مدرسہ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں ایوب خان کو بلا کر ان سے علماء کو پگڑیاں بندھوائیں اور مخصوص حوالوں سے پیر صاحب والا کام شروع کر دیا..... اس موقعہ پر دیوبند کی علمی تحریک سے وابستہ مدارس کے ارباب حل وعقد اکٹھے ہوئے اور علماء اور مدارس کو "حکومتی اثرات" سے بچانے کی تدبیر سوچی۔ مدارس کی تعمیر وترقی، ان کے تحفظ وبقا اور وقتی ضرورتوں سے ان کے نظام ونصاب میں تبدیلیوں کی غرض سے ایک وفاق کی داغ بیل ڈالی، جس کا نام "وفاق المدارس العربیہ" رکھا۔ اس اجلاس کے میزبان حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ عظیم شخصیت مولانا خیر محمد جالندھری تھے، جو اپنی وسعت قلبی کے لحاظ سے تھانوی، مدنی ہر دو طبقوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ احقران دنوں اپنے برادر بزرگ مولانا عزیز الرحمٰن خورشید سمیت ملتان میں مولانا کے مدرسہ خیر المدارس میں زیر تعلیم تھا..... اجلاس ہوا تو اس میں ملک بھر کے سینکڑوں علماء جمع ہوئے۔ مولانا مفتی محمد شفیع کراچی، مولانا سید محمد یوسف بنوری، مولانا فضل احمد کھڈہ، مولانا عرض محمد کوئٹہ، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھا، مولانا عبدالحنان ہزاروی، مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل، مولانا مفتی محمود احمد، مولانا سید شمس

الحق افغانی..... ایسے لوگ وہاں تشریف لائے۔ دل کی طرح سفید براق داڑھیاں' چہروں پر سجدوں کے نشان' سراپا علم و حلم اور اخلاق و شرافت کی چلتی پھرتی تصویریں..... ایسا منظر احقر نے پہلی بار دیکھا۔ مدرسہ میں ۲۔ ۳ دن بہار کا سماں تھا۔ ہماری خوش قسمتی سے خدمت کے لئے منتخب طلبہ میں ہمارا بھی نام تھا' اس لئے ان حضرات کو اور بھی قریب سے دیکھا..... اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ جن حضرات نے بہت ہی متاثر کیا ان میں مولانا عبدالحق کا اسم گرامی سرفہرست تھا۔ یہ معلوم تھا کہ پشاور کے قریب اکوڑہ خٹک کی بستی میں مولانا کا عظیم الشان مدرسہ ہے۔ جسے قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ "پاکستان کا دیوبند" کہتے ہیں۔ تواضع' انکساری اور شفقت و مروت میں مولانا کا جواب نہ تھا۔ بسا اوقات یہ سوچنا پڑتا کہ میزبان ہم ہیں یا مولانا۔

انہیں دیوبند کی درسگاہ سے حصول علم کی سعادت میسر آئی اور وہ ان خوش قسمت حضرات میں سے تھے جنہیں اپنے استاد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد کا بے پناہ اعتماد حاصل تھا۔ مرحوم حصول علم کے بعد دیوبند میں مدرس بھی رہے۔ مولانا مدنی کے فرزند مولانا اسعد مدنی' مولانا احمد علی کے فرزند مولانا عبیداللہ انور اسی دور کے فیض یافتہ تھے اور ان حضرات نے شاگردی کا حق ادا کیا جبکہ مولانا سید حامد میاں بھی اس دور کے شاگرد تھے اور یہ معلوم ہے کہ زندگی کے آخری دور میں استاد شاگرد کا راستہ جدا ہو گیا جبکہ برادر عزیز مولانا فضل الرحمٰن نہ صرف ان کے بلکہ ان کے فرزند گرامی مولانا سمیع الحق کے بھی شاگرد ہیں' لیکن جو صورت حال ہے وہ بہرطور افسوسناک ہے۔

مدرسہ خیر المدارس کے اس دور کی یادیں ذہن میں تھیں کہ فراغت (۱۹۶۶ء) کے بعد جلد ہی راولپنڈی کے ایک مدرسہ میں ختم بخاری شریف کی تقریب میں ان کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے بخاری شریف کی آخری حدیث پر نہایت عالمانہ گفتگو کی جس کو احقر نے مرتب کیا اور ہفت روزہ خدام الدین (میری ادارت سے بہت قبل) کی خصوصی اشاعت میں وہ بڑے اہتمام سے چھپی جس پر بعض عزیز طلبہ نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ پھر احقر مولانا غلام غوث کے حکم سے حضرو خطیب ہو گیا' اب مولانا کے بہت ہی قریب تھا۔ ان کے اور میرے درمیان محض دریائے اٹک حائل تھا کئی مرتبہ حاضری دی۔ استفادہ کیا یہ الگ بات ہے کہ اپنی نالائقی کے سبب آب حیواں سے کماحقہ سیراب نہ ہو سکا۔ میرے عزیز دوست مولانا عبدالکریم صاحب مولانا کے مدرسہ میں مدرس تھے۔ ان کے حوالہ سے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں مولانا کے انتخابی جلسوں میں شرکت کی سعادت میسر آئی۔ مولانا اس میدان کے آدمی نہ تھے

لیکن مولانا غلام غوث ہزاروی کے اصرار پر انہوں نے ۱۹۷۰ء میں الیکشن میں حصہ لیا۔ ان کے مدمقابل خان عبدالغفار خان مرحوم کے دست راست اور خان عبدالولی خان صاحب کے سرپرست 'اجمل خٹک تھے' جنہیں عبرت ناک شکست ہوئی۔ جس کا صدمہ ولی خان کے لئے بہت سخت تھا اور وہ اپنی تمام تر سنجیدگی کے باوجود علماء پر ایسے برسے کہ توبہ بھلی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں مفتی محمود صاحب مرحوم کی مصالح نے جمعیت اور نیپ کو ہم سفر بنا دیا اور مفتی صاحب کا فرزند اب تک اس عہد کو نبھا رہا ہے۔ مولانا نے اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے بڑے بڑے جغادری پارلیمنٹرین حضرات سے بڑھ کر کام کیا۔ اسلام 'قومی اور علاقائی مسائل کے حوالہ سے ان کی عظیم الشان کارکردگی کا ریکارڈ محبّ گرامی مولانا سمیع الحق کی کاوش سے تحریری طور پر سامنے آگیا جس کو دیکھ کر ایک دنیا دنگ رہ گئی کہ ایک مدرسہ کا مہتمم اور شیخ الحدیث اور اس کی یہ بصیرت؟

۱۹۷۷ء میں مولانا پھر سامنے آئے اب قائد عوام مرحوم کے سرحدی وزیر اعلیٰ نصراللہ خان خٹک مولانا کے مدمقابل تھے۔ دوسرے معتبر حضرات کی طرح خٹک صاحب کی بھی خواہش تھی کہ بلا مقابلہ تاج سر پر سجالیں اس لئے اس پڑھے لکھے وزیر اعلیٰ نے جہالت یہ کی کہ الیکشن سے دست برداری کی درخواست مولانا کی طرف سے خود ہی الیکشن کمشنر کو بھجوادی اور دستخط کئے "مولانا عبدالحق صاحب۔"

اس حرکت کے خلاف اپیل ہوئی تو مسٹر بروہی مرحوم نے اپنی سعادت خیال کرتے ہوئے مولانا کا وکیل بننا پسند کیا گو کہ انہیں کوئی خاص محنت نہ کرنا پڑی اور بھٹو صاحب کے چہیتے چیف الیکشن کمشنر..... موجودہ وزیر قانون کے والد گرامی..... جسٹس سجاد جان نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر خود ہی مولانا کی وکالت کی..... کہ وہ متعدد مرتبہ اس درویش سے اس کی کٹیا میں مل چکے تھے۔ اس کے علم 'اس کی شرافت 'اس کے خلوص و تقویٰ اور اس کی وضع داری سے واقف تھے۔ انہوں نے ان سے کئی مرتبہ استفادہ کیا۔ مشکل علمی مسائل میں رہنمائی چاہی اور کہا کہ ایسے دستخط کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے..... بلکہ شاید وہ بھی نہ کرے..... مولانا جیسے آدمی کے یہ دستخط کہ مولانا اور صاحب کے لاحقے سابقے ساتھ؟ بھٹو صاحب مرحوم اس درویش سے آگاہ تھے۔ ان کی خودسری نے اسے شکست سے دوچار کرنے کی غرض سے اپنے وزیر اعلیٰ کو حکم دے کر یہ حرکت کرائی جس کا خٹک صاحب کو بہت رنج تھا اور افسوس سے کہتے تھے کہ ایک درویش سے مجھے لڑانے کی کوشش کی گئی اور اس طرح عزت سادات سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اس الیکشن میں مولانا مطلق کہیں نہ جاسکے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح یہ الیکشن اس طرح لڑا کہ علالت کے سبب بستر پر ہیں۔ خدام مصروف عمل ہیں اور بہت بڑی اکثریت سے فتح حاصل کی۔ اسی طرح ۸۵ء کے غیر جماعتی الیکشن میں جماعتی بزرگوں اور احباب کی خواہش پر کامیابی سے الیکشن لڑکر ریکارڈ قائم کیا..... وہ اپنے حلقہ کے ہی نہیں پورے ملک کے محبوب رہنما تھے۔

مولانا کا مدرسہ ایک ایسی بستی میں واقع ہے جہاں دشمنان دین وانسانیت سے حضرت الامیر سید احمد بریلویؒ قدس سرہ کی پہلی باقاعدہ جھڑپ ہوئی۔ دریائے کابل کے کنارے اس بستی کے در و دیوار سید صاحب اور ان کے مخلص رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے گواہ ہیں۔ دریا کی لہروں نے اس قافلہ سخت جان کی پذیرائی کی۔ اے کاش خوانین پشاور وہزارہ وفا کرتے تو برعظیم کا نقشہ مختلف ہوتا۔ اکوڑہ کی بستی میں مولانا کا مدرسہ تھا جو بقول مہتمم دارالعلوم دیوبند پاکستان کا دیوبند ہے اس میں تعلیم وتدریس کی طرح جہاد کی تعلیم وتربیت بھی ہوتی ہے گویا دیوبند کے قدم بہ قدم..... ہر سال سینکڑوں طلبہ فراغت اصل کرتے ہیں..... وہ جہاں نعمت علم سے سرشار ہو کر نکلتے ہیں وہاں جذبات حریت وجہاد سے ان کے قلوب لبریز ہوتے ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ افغانستان کی موجودہ جنگ سے ہو رہا ہے' جس کے درجنوں محاذوں پر مولانا کے شاگرد کمان کر رہے ہیں تو ہزاروں مختلف مورچوں پر سرگرم عمل ہیں..... سینکڑوں شہادت کی سعادت حاصل کر چکے ہیں' چونکہ خلوص وللہیت ان کا سرمایہ ہے اس لئے بعض پروپیگنڈسٹوں کی طرح کوئی چرچا ہے نہ ہنگامہ..... بلکہ فرض کی ادائیگی میں ہر شخص مصروف ہے۔ سرحد و بلوچستان اور افغانستان سے تاشقند و بخارا تک مولانا کے شاگردوں کی محنت نظر آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وقت کا ابو حنیفہ یا بخاری (رحمہما اللہ تعالیٰ) چاروں طرف فیض لٹا رہا ہے۔ مدرسہ کا جلسہ تقسیم اسناد چند سال کے وقفہ سے ہوتا ہے جس میں ملک بھر کے علماء' مشائخ اور اہل دین شامل ہوتے ہیں۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جب تک سفر و تقریر کے قابل رہے وہ تشریف لے جاتے۔ مولانا احمد علی لاہوری کو حضرت مدنی نے دیوبند سے خط لکھا کہ میرے لئے سفر پاکستان مشکل ہے مولانا عبدالحق کے مدرسہ میں آپ کا جانا اپنی ذات کے حوالہ سے ہی ضروری نہیں' میری نیابت کا فرض بھی ادا ہو گا۔ مولانا لاہوری جو ہم عصر ہونے کے باوجود حضرت مدنی کا بے پناہ احترام فرماتے..... زندگی بھر تشریف لے جاتے رہے۔ حضرت شیخ الہند کی آخری نشانی مولانا عزیز گل ہمیشہ سرپرستی فرماتے ہیں' جلسہ عجیب شان سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے بھی جلسہ دیکھا' غالباً ۶۹ء یا ۷۰ء تھا' چند سال بعد

جلسہ ہوا۔ ایک دن ظہر کی نماز سے قبل جلسہ شروع ہوا تو نمازوں کے وقفہ کے ساتھ اگلے دن ظہر کو ختم ہوا۔ رات دن کے ہر مرحلہ میں وقت کے اکابر علماء کی تقریریں..... مثلاً مولانا محمد ادریس کاندھلوی' مولانا شمس الحق افغانی' مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا محمد علی جالندھری..... وغیرہ' کسی مرحلہ پر تیس چالیس ہزار سے کم مجمع نہ تھا۔ جوانی کے سبب جاگنے کی مشق ہمیں خوب تھی اس لئے اس منظر کو خوب دیکھا اور ایک لطف محسوس ہوا۔ اس مرحلے پر مختلف اوقات میں کم از کم چالیس ہزار افراد نے کھانا بھی کھایا..... کھانا ایسے جاری رہا کہ جلسہ کی حاضری اور پروگرام ایک لمحہ کے لئے متاثر نہیں ہوا۔ کھانا ایسا پاکیزہ اور لذیذ کہ شاہوں کو میسر نہ آئے۔ بڑے چھوٹے کی تمیز نہ تھی درجنوں تندور تھے جن میں مخصوص پشاوری روٹی پک رہی تھی اور سینکڑوں دیگیں پک رہی تھیں۔ علاقہ بھر کے لوگ جلسہ میں شریک ہوتے ہیں لیکن خالی ہاتھ نہیں بیل' گائے' بکری' دنبہ' چاول' آٹا' دالیں' گھی..... الغرض ہر شخص بقدر ہمت کچھ نہ کچھ لا رہا ہے' درجنوں قصاب جانور ذبح کرنے اور گوشت بنانے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح درجنوں باورچی لذیذ گوشت اور پلاؤ پکانے میں محو..... یہ سب مولانا کے خلوص کی برکت تھی۔ جبکہ کھانے پینے کی سینکڑوں دکانیں مستزاد..... میں نے یہ منظر زندگی بھر نہ دیکھا۔ رات کے آخری مرحلہ میں مولانا محمد علی جالندھری کی ساڑھے تین گھنٹے تقریر ہوئی۔ پنجابی کا ابوالکلام سٹیج پر آیا تو مولانا عبدالحق نے "متکلم اسلام" کے حوالہ سے تعارف کرایا۔ نماز فجر پر تقریر ختم ہوئی گلابی اردو اور مثالوں کے ذریعہ مدلل تقریر کا حال یہ تھا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دریائے کابل جو جلسہ گاہ کی پشت پر بہہ رہا تھا اس کے پانی کی روانی زیادہ ہے یا مولانا کی تقریر کی..... مولانا نے علمی' دینی اور اس نوع کے فتنوں کی نشاندہی کی' جدید اعتزال اور جدید سبائیت پر ان کا تبصرہ اتنا بھرپور تھا کہ جلیل المرتبت علماء داد دے رہے تھے۔ مولانا نے بتلایا کہ کس طرح بعض لوگ اسلامی نظام کی اجارہ داری کے پردہ میں اصل اسلام کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں اور کس طرح اسلاف سے نئی نسل کا اعتماد ختم کر رہے ہیں۔

میں نے چند مرتبہ مولانا عبدالحق کے دولت کدہ پر ان سے ملاقات کی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ عظیم الشان مدرسہ کا بانی' کیسے نیم پختہ اور پرانے طرز کے مکان میں مقیم ہیں..... سچی بات یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے بعد مولانا میرے خیال و مشاہدہ کے مطابق تیسرے بزرگ تھے جن کا مکان اس قدر سادہ' بوسیدہ اور برائے نام تھا۔ آج کے مہتمم حضرات کے ہاتھ رومز میں بجلی کے پنکھے اور قد آدم شیشے نصب ہیں جبکہ دین کے غم میں گھلنے والے بہت سے مدعیوں کی زندگی

دین لانے والے نبی رحمت اور پیغمبر معصوم کی زندگی سے کوسوں دور ہے۔ البتہ جو چند رندان قدح خوار دیکھے ان میں مولانا کا نام امتیازی حیثیت سے شامل ہے۔ جو لوگ مولانا سے عمر میں بڑے تھے ان کا احترام تو وہ کرتے ہی تھے' اپنے ہم عصروں حتیٰ کہ چھوٹوں کے لئے ان کا رویہ عجیب و غریب تھا..... ایسی تواضع اور ایسی فروتنی کہ میرے جیسا شخص بسا اوقات دم بخود رہ جاتا..... ایسی مثالیں کتابوں میں نظر آتی ہیں' اب اللہ تعالیٰ کی زمین پر ان کی تلاش مشکل ہے۔ یہ دور تو انسانیت کی توہین و تذلیل کا دور ہے جبکہ جاگیردار' وڈیرہ' صنعتکار' برخود غلط مولوی' صاحب زادہ اور فقر غیور سے محروم پیر اپنے مزارع' مزدور' مقتدی اور مرید سے چار فٹ اونچا بیٹھتا اور اسوۂ رسولؐ کا مذاق اڑاتا ہے..... ایسے دور میں مولانا کا وجود روشنی کا مینار تھا' اسوۂ رسولؐ و صحابہ کی چلتی پھرتی تصویر۔ اخلاق نبویؐ کا سراپا اور علم و حلم کی ڈھلی ہوئی تصویر..... ان کی خوش نصیبی قابل رشک ہے کہ ساری عمر قال اللہ اور قال الرسول کی خدمت میں گزار دی۔ حدیث کی معروف کتاب ترمذی کی نامکمل لیکن شاہکار شرح اور دسیوں علمی اور دینی کتابیں' عظیم الشان مدرسہ..... اس کی ان گنت شاخیں' ہزاروں سراپا علم و خلوص شاگرد اور صاحب علم و شرافت اولاد..... جس کا یہ ترکہ ہو اس پر رشک کیوں نہ کیا جائے۔

کتنی سعادت ہے کہ اپنے ہی دارالعلوم کے اس احاطہ میں دفن ہوئے جہاں ہزاروں بچے قرآن حفظ و ناظرہ پڑھ کر جا چکے ہیں اور روزانہ سینکڑوں پڑھتے ہیں..... دھرتی پر اللہ تعالیٰ کا نام جب تک لیا جائے گا اور قرآن کریم پڑھا جاتا رہے گا..... مولانا کی روح کی آسودگی کا سامان رہے گا۔ تلاوت قرآن کے زمزموں سے ان کی مقدس روح سرشار ہوتی رہے گی اور ہر آنے والا اس درویش خدامست کی قسمت پر رشک کرے گا۔

بقیہ: طلبائے تنظیم اسلامی

یہ بتایا کہ فرائض دینی کے بارے میں امت مسلمہ کے ہر فرد کا معاملہ یکساں ہے' شعور حاصل کر لینے اور بلوغت کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بلا تخصیص ہر شخص بشمول طلباء ان کا مکلف ہے۔ امیر تنظیم نے فرائض دینی کی بہت مفصل اور دلپذیر تشریح فرمائی۔ طلبہ کے مسائل کے ضمن میں امیر تنظیم نے بتایا کہ ان کے مسائل معاشرے کے مسائل سے جداگانہ کوئی وجود نہیں رکھتے۔ یہ تقسیم مخصوص مفادات کے حامل لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے دین کا یہ مزاج نہیں ہے۔ اس اجلاس کی کارروائی کے ساتھ رات دس بجے طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کا پہلا سالانہ کنونشن اختتام پذیر ہوا۔

رفتارِ کار

امیر تنظیم اسلامی کا دورۂ وہاڑی و بہاولپور

مرتبہ: محمد سعید بھٹہ، منظور حسین

رفیق محترم جناب رانا غلام اکبر صاحب کے فرزند سیف الرحمٰن اور رفیق محترم محمد یونس چودھری صاحب کی دختر نیک اختر کا نکاح مسنون ۲۹ر اگست کو وہاڑی میں ہونا طے تھا۔ امیر محترم اور میاں محمد نعیم صاحب (ناظم اعلیٰ) بھی اس میں شرکت کے لئے تشریف لا رہے تھے۔ لہٰذا رفقائے تنظیم اسلامی وہاڑی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دعوتی پروگرام طے کیا اور اس کے لئے بھرپور محنت کی۔

امیر محترم کے خطاب عام اور محفل نکاح کے انعقاد کے لئے وہاڑی کی تاریخی جامع مسجد کا انتخاب ہوا۔ انتظامیہ سے رابطہ اور ضروری اجازت کے مراحل رفقائے وہاڑی نے بہت مستعدی سے سر کئے اور عجلت میں طے کئے ہوئے اس پروگرام کے بقیہ انتظامی معاملات کو بھی بحسن وخوبی انجام دیا۔ امیر تنظیم اسلامی کے خطاب کا عنوان تھا "سیرت النبیؐ کا انقلابی پہلو"۔ اصلاح الرسوم پر بھی روشنی ڈالی گئی اور خطاب عام کے بعد اسی مسجد میں نکاح مسنونہ کی پروقار تقریب منعقد ہوئی۔ حاضرین کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ تھی۔ رفقائے تنظیم اسلامی وہاڑی کی جانفشانی اور حسنِ تدبیر کے علاوہ اس پروگرام کی کامیابی میں مرکز حلقہ ملتان کے تعاون کو بھی دخل ہے۔ ہینڈ بلز، دعوتی کارڈز کی تیاری کے علاوہ رابطہ عوام وخواص کے لئے کارکنوں نے بہت محنت کی۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے اور مزید توفیق خیر کی سعادت سے بہرہ مند کرے۔

مجلس شوریٰ حلقہ جنوبی پنجاب نے سولہ اگست کو اپنے اجلاس میں رفقاء کے لئے دو روزہ سہ ماہی تربیتی اجتماع ستمبر کے پہلے ہفتہ میں بہاولپور منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق تربیتی اجتماع کینال کالونی بہاول پور کی جامع مسجد میں ۸ر ستمبر کو صبح ۹ بجے شروع ہوا اور ۹ر ستمبر کی شام کو اختتام پذیر ہوا۔

اس اجتماع میں امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔ بہاول پور ملتان سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر مین لائن پر واقع ایک تاریخی اور خوبصورت شہر ہے۔ اس شہر میں رفقائے تنظیم اسلامی حلقہ جنوبی پنجاب کا یہ پہلا اجتماع تھا جو دعوت وتبلیغ اور تربیت وتنظیم کے نقطہ نظر سے انتہائی کامیاب رہا۔ بہاول پور کی فضائیں دو دن تک داعیٔ انقلاب اسلامی کے انقلاب آفریں خطابات سے گونجتی رہیں۔ اس اجتماع کی تیاری، منصوبہ بندی اور تشہیر کے سلسلہ میں بہاول پور کے نقیب اسرہ جناب محمد سلیم اختر صاحب کے علاوہ رفیق محترم جناب ڈاکٹر عمر علی خان، جناب جاوید اختر اور دیگر رفقاء واحباب نے انتھک محنت کی۔ بہاول پور شہر کے لوگوں کی طرف سے جو بھرپور ملا وہ ان کی بہترین کارکردگی اور حسن انتظام کا مظہر تھا۔

۸ر اگست ۱۹۸۸ء بروز جمعرات رفقاء صبح آٹھ بجے ہی کینال کالونی کی خوبصورت مسجد میں پہنچ گئے۔ مسجد کے امام وخطیب مولانا حبیب احمد صاحب نے استقبال کیا۔ مذکورہ مسجد انتہائی سرسبز اور پرفضا مقام پر واقع ہے اور

حسن تعمیر کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ گیارہ بجے اجتماع کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ حاضری ۵۰ تھی۔ یہ اجلاس دن کے ایک بجے تک جاری رہا۔ میاں محمد نعیم صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا۔ ان کا خطاب جامع اور مفصل تھا جسے رفقاء نے شوق اور انہماک سے سنا۔ اپنے خطاب میں انہوں نے تربیتی اور تنظیمی نصاب کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ خاص طور پر اس کے عملی پہلوؤں سے رفقاء کو روشناس کرایا۔ اُن کی تقریر نے جہاں رفقاء کے شوق اور ولولے کو ابھارا وہاں تربیتی نصاب سے متعلق الجھنوں اور اشکالات کو رفع کرنے میں مدد دی۔ میاں صاحب کی مفصل گفتگو کے بعد جناب مختار حسین فاروقی نے رفقاء کو خود احتسابی کی طرف توجہ دلائی اور رفقاء سے فرداً فرداً ان کی کارکردگی اور رفتار کار کے بارے میں رپورٹ لی۔ ہر رفیق نے کھڑے ہو کر اپنی کارکردگی بیان کی۔ گزشتہ کوتاہیوں پر شرمندگی کا اظہار کیا اور آئندہ کی تلافی اور اصلاح کا عزم مصمم کیا۔ آخر میں مبصر کی حیثیت میں شریک رحیم یار خان کے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے اپنے تاثرات بیان فرمائے اور تربیتی و تنظیمی اجتماع کے انعقاد پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ یوں اجتماع کی پہلی نشست دن کے ایک بجے اختتام پذیر ہوئی۔

اجتماع کی دوسری نشست بعد نماز عصر شروع ہوئی اور نماز مغرب سے قبل اختتام پذیر ہوئی۔

مغرب کی نماز کے بعد امیر محترم نے مسجد میں مختصر خطاب فرمایا۔ رفقائے تنظیم اسلامی کے علاوہ مقامی نمازیوں سے مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ امیر محترم نے انفرادی سیرت و کردار، زہد و تقویٰ اور تزکیہ نفس کو اپنا موضوع سخن بنایا اور اس موضوع سے متعلق آیات قرآنی اور احادیث شریفہ کی روشنی میں نہایت حکیمانہ باتیں ذہن نشین کرائیں جس سے زہد و تقویٰ کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں چھٹتی چلی گئیں اور دل احادیث شریفہ کے نورانی اثرات سے منور ہو گئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر رفقاء کے مختلف قافلے قائداعظم میڈیکل کالج کی طرف روانہ ہونے شروع ہوئے، جہاں بعد نماز عشاء بوائز ہاسٹل فیصل ہال میں "حقیقت جہاد" کے موضوع پر امیر محترم کا خطاب ہونے والا تھا۔ خطاب کی دعوت وہاں کی اسلامی جمعیت طلبہ نے دی تھی۔ ہاسٹل کے بیچوں بیچ ایک وسیع و عریض سبزہ زار میں بڑے قرینے اور سلیقے کے ساتھ صوفے اور کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ سامنے پروقار سٹیج بنی ہوئی تھی۔ اس تقریب کے حسن انتظام کو دیکھ کر منتظمین کے نظم و ضبط اور صلاحیت انتظام کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے تشریف لانے تک پنڈال کھچا کھچ بھر چکا تھا اور طلباء و حاضرین اشتیاق کے ساتھ خطاب کے منتظر تھے۔ امیر محترم کے تشریف لانے کے فوراً بعد سٹیج سیکرٹری نے امیر محترم کا مختصر تعارف کرایا۔ رات کی خاموشی اور پرسکون فضا میں ڈاکٹر صاحب کی پروقار اور انقلاب آفریں آواز دلوں کو گرما رہی تھی۔ امیر محترم نے جہاد کے لفظی و اصطلاحی مفاہیم واضح فرماتے ہوئے جہاد کے مختلف مدارج کا ذکر انتہائی شرح و بسط کے ساتھ فرمایا۔ مسلمانوں کے دینی فرائض یعنی عبادت رب، شہادت علی الناس اور اقامت دین کے لئے ہر سطح پر جہاد فی سبیل اللہ کے لوازم واضح فرمائے اور جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں پر سے پردہ اٹھایا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی اس تقریر کو سامعین نے سکون اور تحمل کے ساتھ سنا۔ تقریر کے اختتام پر سوال و جواب کی محفل جمی جس میں طلباء کا اشتیاق دیدنی تھا۔ امیر محترم سٹیج سے اتر کر ان میں اس طرح گھل مل گئے کہ اجنبیت کا کوئی شائبہ بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ امیر محترم اپنے ہی مقصد و ہم سفر اعوان و انصار میں تشریف فرما ہیں۔

سوال وجواب کی نشست کے بعد طلبہ وحاضرین نے انتہائی جوش وخروش اور محبت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو الواع کہا۔ پنڈال کے باہر تنظیم اسلامی حلقہ ملتان نے مکتبہ لگایا ہوا تھا جہاں بڑی رونق تھی اور لوگ بھرپور دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ یوں رات گئے یہ تقریب سعید انتہائی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

جامع مسجد کینال کالونی کے خطیب حضرت مولانا حبیب احمد صاحب نے رفقائے تنظیم اسلامی کی رہائش و اجتماع کے لئے اپنی مسجد 'حجرہ' سٹور اور باتھ روم کی چابیاں کمال عنایت سے ہمیں عطا فرمائی ہوئی تھیں کہ ہم جس طرح چاہیں ان سے استفادہ کریں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ موصوف کا اصرار تھا کہ داعئ حق امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج بعد نماز فجر ہماری مسجد میں درس قرآن مجید دیں۔ گو امیر محترم کے خطابات کا شیڈول خاصا ٹائٹ تھا مگر ہم ان کے خلوص کے پیش نظر انکار نہ کر سکے۔ امیر محترم نے نماز فجر کے بعد سورۃ الحجرات کی آیات کے حوالے سے اپنے مخصوص انداز اور دل نشین پیرایہ میں ایمان قانونی اور ایمان حقیقی کا فرق واضح فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تصدیق بالقلب اور جہاد فی سبیل اللہ ایمان حقیقی کے دو رکن رکین ہیں اور فلاح و نجات اخروی ان دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ گویا آج کا درس خود جاگو اور دوسروں کو جگاؤ کی پکار تھا۔ محفل درس میں اہل علم و دانش کے علاوہ اعلیٰ آفیسرز بھی موجود تھے۔ حاضرین کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی۔ چند خواتین بھی اس درس میں باپردہ شریک ہوئیں۔ درس کے بعد امیر محترم نے بھی دیگر شرکاء کے ساتھ سادہ ناشتہ میں شرکت کی اور پھر قدرے آرام کے لئے اپنے کمرہ میں تشریف لے گئے کیونکہ چند ہی گھنٹوں کے بعد ارم ہوٹل میں علماء و دانش وران بہاول پور سے خطاب کا پروگرام تھا۔ ارم ہوٹل بہاول پور کے قلب چوک فوارہ کے قریب کھلی فضا میں واقع ہے۔ ارم ہوٹل میں علماء کا استقبال کرنے والے رفقاء جانب ہوٹل روانہ ہوئے جبکہ بقیہ رفقاء تلاوت کلام مجید اور باہمی تعارف میں مصروف رہے۔ ہوٹل پہنچے تو علماء کرام' پروفیسر صاحبان اور دانشور حضرات تشریف لا رہے تھے۔ ہم ان کے استقبال اور ہال کی طرف رہنمائی میں مصروف رہے۔ ملتان شہر اور احمد پور شرقیہ سے بھی علماء کرام ہماری دعوت پر تشریف لائے۔ پروگرام قدرے تاخیر سے شروع ہو سکا۔ آغاز رفیق مکرم حافظ محمد رفیق صاحب کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ موصوف نے سورۃ صف کے آخری رکوع کی تلاوت فرما کر گویا نبی اکرمؐ کے مقصد بعثت کی طرف اشارہ فرمایا اور من انصاری الی اللہ کی صدا بلند کی۔ جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے امیر محترم کو دعوت خطاب دی۔ امیر محترم کے خطاب کے وقت ہال تقریباً بھر چکا تھا چونکہ محفل اہل علم و دانش کی تھی لہٰذا امیر محترم کے خطاب کا رنگ ہی نرالا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے ہی پر اعتماد انداز میں اہل علم و دانش کو "علم کی توحید" کی جانب توجہ دلائی۔ علماء کرام سے بڑے درد کے ساتھ اپیل کی کہ آپ دین کے محدود تصور سے نکلیں اور غلبہ و اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد سے ہماری سرپرستی فرمائیں۔ دانشوروں کو مشورہ دیا کہ وہ عربی زبان سے واقفیت حاصل کر کے علوم دینیہ سے براہ راست آگاہ ہوں اور اسلام و ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کریں۔ امیر محترم نے حاضرین کے سامنے یہ بات رکھی کہ علم الوحی کو علم الحواس پر کئی درجہ فوقیت حاصل ہے۔ مگر جب تک ہم جدید مفکرین و فلاسفہ کے گمراہ کن فلسفوں سے کماحقہ آگہی حاصل نہیں کر لیتے ان کا رد ممکن نہیں۔ نوجوانوں کے اذہان میں طحد فلاسفہ نے شکوک و شبہات اور الحاد و مادہ پرستی کے جو کانٹے چبھو دیئے ہیں انہیں جدید علوم اور قرآن و حدیث کے علوم و معارف سے مسلح ہو کر ہی نکالا جا سکتا ہے۔ امیر محترم نے تاریخ اسلام کے حوالہ سے امت مسلمہ کے عروج و زوال پر بھی روشنی ڈالی اور علم کی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کے اسباب گنوائے۔ خطاب کے بعد سوال جواب کی نشست ہوئی۔ اس طرح یہ با برکت محفل دن کے گیارہ بجے برخاست ہوئی۔

شاہی جامع مسجد الصادق بہاول پور میں امیر محترم کا خطبۂ جمعہ طے تھا جس کی مناسب تشہیر بذریعہ ہینڈ بل، پوسٹرز کی گئی تھی۔ خطبۂ جمعہ ٹھیک ایک بجے ہونا تھا۔ لہٰذا رفقاء و منتظمین نماز جمعہ کی تیاری کے لئے اپنے ہیڈ کوارٹر (جامع مسجد کینال کالونی) کی جانب پلٹے جہاں رفیق محترم سیف الرحمٰن خان خلف الرشید رانا غلام اکبر خان کی دعوت ولیمہ ان کی منتظر تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر تمام رفقاء شاہی جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ مسجد اسلامی ثقافت کا حسین مرقع تو ہے ہی لیکن خطیب شاہی مسجد حضرت مولانا قاضی رشید احمد صاحب کی ہمہ گیر اور دل نواز شخصیت نے بھی اسے مرجع خلائق بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے کمال لطف و کرم سے نہ صرف ہمیشہ ہماری سرپرستی فرمائی بلکہ جب کبھی بھی مسجد میں خطاب کے لئے عرض کیا گیا تو مسجد میں خطاب کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ مسجد میں حاضری لگ بھگ چار ہزار تھی۔ امیر محترم نے قبل جمعہ افتتاحی کلمات کے طور پر حکمت و احکام جمعہ اور نبی اکرمؐ کے مقصد بعثت اور طریق تربیت پر مختصر روشنی ڈالی۔ اصل خطاب نماز جمعہ کے بعد ہوا۔ عنوان تھا "پاکستان کے موجودہ ناگفتہ بہ حالات اور تنظیم اسلامی کی پکار" امیر محترم نے اہل وطن کو حصول پاکستان کے مقاصد سے روگردانی پر اس کی سزا و عقوبت کے طور پر قومی و ملی سطح پر مرض نفاق کے تسلط کا احساس دلایا۔ اور اجتماعی توبہ اور اصل مقصد کی جانب رجوع و التفات پر زور دیا۔ امیر محترم کے ہر دو خطابات عام کے موقع پر مکتبہ بھی لگایا گیا اور تنظیم اسلامی کا تعارف بھی تقسیم کیا گیا۔ خطیب مسجد حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ نے ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی تحسین فرمائی اور ہماری دعوت و فکر پر سنجیدگی سے غور و خوض کا وعدہ فرمایا۔

نماز عصر کے بعد رفقاء کا اختتامی اجلاس ہوا جس میں جناب محمد نعیم صاحب نے اہم ہدایات دیں۔ بعد ازاں امیر تنظیم اسلامی حلقہ ملتان نے ان وفود کی تجدید کی جو قبل ازیں مختلف اضلاع میں بغرض تبلیغ تشکیل دیئے گئے تھے۔ امرائے وفود کو تاکید کی گئی کہ وہ اپنے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر ماہ ستمبر کے اواخر تک دو روزہ تبلیغی دورے مکمل فرما کر مرکز ملتان رپورٹ کریں۔ رفقاء و شرکاء تربیت گاہ کا شکریہ ادا کیا گیا اور اختتام پر رفقاء کی توجہ بہاول پور کے جملہ پروگراموں پر اٹھنے والے اخراجات کی جانب مبذول کرائی گئی۔ صاحب حیثیت رفقاء نے اکثر و بیشتر اخراجات کو برداشت کرنے کا وعدہ فرمایا۔ نماز مغرب سے قبل ہی اس اجتماع کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ بہاول پور سے باہر کے رفقاء تو دو روزہ تربیتی و توسیع دعوت کے خوش گوار پروگرام کی سہانی یادیں اور اک ولولۂ تازہ لئے گھروں کو رخصت ہوئے جبکہ امیر محترم کو ابھی نماز مغرب کے بعد اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کی تقریب میں خطاب فرمانا تھا۔

حاضری قریباً سو تھی جس میں میڈیکل کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ و پروفیسرز موجود تھے۔ خطاب کا عنوان تھا "اسلام میں خدمت خلق کا تصور"۔ امیر محترم نے محض طبی خدمات پر قانع خادمین خلق کے سامنے اعلیٰ و اکمل خدمت خلق کا جامع تصور "یعنی پوری انسانیت کو ہلاکت و بربادی سے بچا کر فلاح و نجات اخروی کے راستہ پر گامزن کرنا" پیش کیا۔

مقامی حلقوں کا کہنا ہے کہ اکثر و بیشتر پروفیسرز جو کبھی بھی اس قسم کے لیکچرز میں شریک نہیں ہوتے، بطور خاص امیر محترم کے لیکچر میں شریک ہوئے۔ امیر محترم جناب میاں محمد نعیم صاحب کی معیت میں بذریعہ ٹرین رات کے ایک بجے لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اہل بہاول پور کے دلوں کو داعیٔ انقلاب اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پکار پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے اور ان کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز

★★★

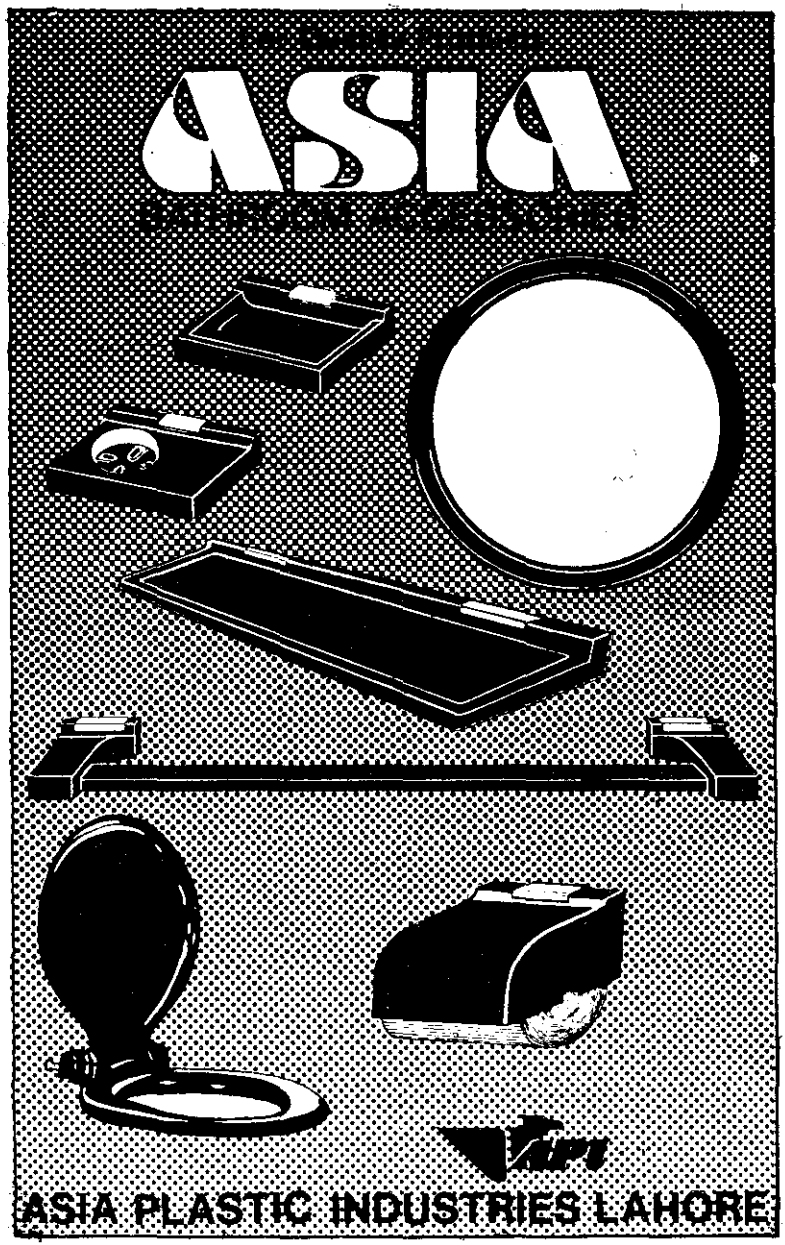
ASIA
BATHROOM ACCESSORIES
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان
فون: ۲۲۱۵۹۸-۳۱۲۷۵۴

SV ADVERTISING

Jawad®
Products

We are manufacturing and exporting ready made garments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedlinen, cotton bags, textile piece goods etc.

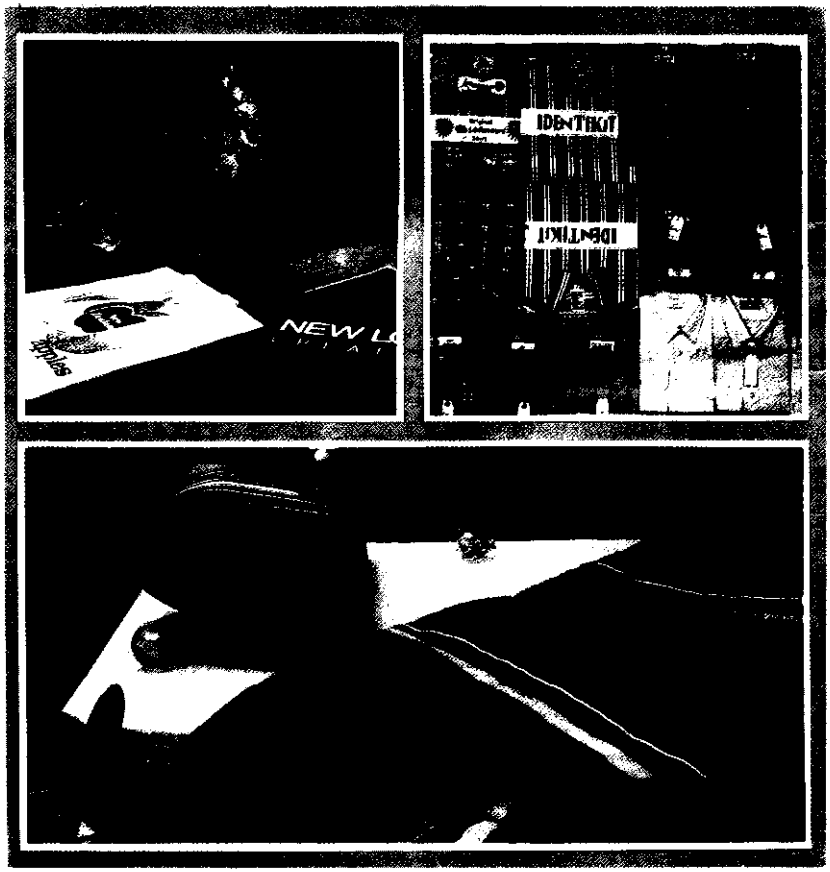

For further details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 37 No.10
OCTOBER 1988

وقت کا صاحبِ عزیمت

ہمارا یہ دَور سائنٹیفک دَور ہے اس دَور میں کام کے لیے بہت سے وسائل پیدا ہو گئے ہیں اور نئے نئے راستے نئی نئی راہیں ہموار ہیں بشرطیکہ کوئی عزم و یقین کے ساتھ اُٹھے اور کسی کے دل میں اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ صادق موجود ہو، تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ خدا کے بندوں نے پوری طرح سے بے سروسامانی کے عالم میں کامیاب کوششیں کیں اور آج ہم باوجود جملہ وسائل مہیا ہونے کے سعی و عمل کے میدان میں اپنے آپ کو بہت پیچھے پا رہے ہیں ہمارا یقین محکم تو وہ ہونا چاہیے تھا جس کا اظہار کبھی ایک مجاہد وقت نے کیا تھا "بڑوں بڑوں کا عذر ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان اسباب و وسائل فراہم نہیں لیکن وقت کا عازم اُٹھتا ہے اور کہتا ہے۔ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اسے ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا ——— اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اُترنا چاہیے اگر آدمی نہیں ملتا تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسان کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ ہے؟

درختوں کو دوڑنا چاہیے، اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے۔ وہ زمانے کا محکوم نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے"

از **افادات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم**

بحوالہ ہفت روزہ "الاسلام" لاہور